مختار ٹونکی

شخصیت اور ادبی کارنامے

تحقیقی مقالہ

برائے پی۔ایچ۔ڈی۔ڈگری (اردو)

یونیورسٹی آف کوٹہ، کوٹہ (راجستھان)

(فیکلٹی آف آرٹس)

ریسرچ اسکالر

سلطانہ فاطمہ انصاری

زیرنگراں

ڈاکٹر نادرہ خاتون

صدر شعبۂ اردو

گورنمنٹ آرٹس گرلس کالج، کوٹہ

یونیورسٹی آف کوٹہ، کوٹہ (راجستھان)

2021

Certificate

I feel great pleasure in certifying that the thesis entitled **"Mukhtar Tonki Shakhsiyat aur Adbi Karname"** has been written by **Sultana Fatima Ansari** under my guidance. She has completed the following requirements as per Ph.d. regulations of the university.

a) Course work as per the university rules.
b) Residential requirements of the university. (200 days)
c) Regularly submitted annual progress report.
d) Presented his work in the department committee.
e) Published research papers in referred research journals.

I recommend the submission of the thesis.

Place : Kota
Date :

Dr. Nadira Khatoon
Research Supervisor

ANTI-PLAGIARISM CERTIFICATE

It is certified that Ph.D. thesis entitled **"Mukhtar Tonki Shakhsiyat aur Adbi Karname"** by **Sultana Fatima Ansari** has been examined by us with the following anti-plagiarism tools. We undertake the follows:-

a. Thesis has significant new work/knowledge as compared already published or are under consideration to be published elsewhere. No sentence, equation, diagram, table, paragraph or section has been copied verbatim from previous work unless it is placed under quotation marks and duly referenced.

b. The work presented is original and own work of the author (i.e. there is no plagiarism). No ideas, processes, results or words of other have been presented as author's own work.

c. There is no fabrication of data or results which have been compiled and analyzed.

d. There is no falsification by manipulating research materials, equipment or processes, or changing or omitting data or results such that the research is not accurately represented in the research record.

e. The thesis has been checked using **Urkund Software** and found within limits as per HEI plagiarism Policy and instructions issued from time to time.

Sultana Fatima Ansari
Research Scholar
Place:
Date:

Dr. Nadira Khatoon
Research Supervisor
Place:
Date:

اختصار

(Abstract)

مختار ٹونکی کی شخصیت دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں ہے ۔ وہ ایک صاحب نظر ادیب اور قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ راجستھان میں طنز ومزاح نگار کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ اس حیثیت سے وہ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔علاوہ ازیں وہ ایک افسانہ نگار، خاکہ نگار، انشائیہ نگار، تحقیق و تنقید نگار کے ساتھ ساتھ ادب اطفال نگار کے طور بھی ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔

مختار ٹونکی کے فکر وفن اور ان کے ادب میں مقام کے تعین کے تعلق سے ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقات کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لینے کی کوشش اس مقالے میں کی گئی ہے جس کو مندرجہ ذیل چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول :۔ ریاست ٹونک کا تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر

اس باب میں ریاست ٹونک کے تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ وہاں کے حکمراں طبقے (مسلم و غیر مسلم) کا عہد در دعہد جائزہ لینے کے ساتھ ہی وہاں کی تہذیب وثقافت اور ادبی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ یہ وہ ریاست ہے جو ہر اعتبار سے لکھنؤ کی تہذیب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اپنی ادبی خدمات کی بدولت ہی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے جہاں کے حکمرانوں نے ادب کی آبیاری کے لیے ہر ممکن خدمات انجام دی۔ان خدمات میں وہاں پر ملکی سطح پر منعقد ہونے والے مشاعرے بھی ہیں جن میں ملک کے معتبر شعرائے کرام کی شرکت ہوا کرتی تھی۔اس کے علاوہ وہاں کے تحقیقی اور تنقیدی کام بھی محتاج تعارف نہیں ہیں جن کی وجہ سے وہاں ادبی فضا قائم رہی اور پھر وہاں سے عالم ادب کو وہ ادبی سرمایہ ملا جو اپنی مثال آپ ہے جو اردو دنیا میں ایک مقام ومرتبہ کا حامل ہے۔اس باب میں ریاست ٹونک کی تاریخ، تہذیب اور ادبی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب دوم :۔ مختارؔ ٹونکی کے سوانحی کوائف

باب دوم کے تحت مختارؔ ٹونکی کے زندگی کے حالات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس میں ان کے خاندانی حالات ، ان کی ولادت ،تعلیم و تربیت ، ملازمت اور ادب سے ان کے والہانہ عشق اور اس میں کی گئی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ لینے کے کوشش کی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ مختار صاحب سے خود ملاقات کر کے ان سے اخذ کی گئی معلومات کو قلم بند کرنے کے کوشش ہے ۔

باب سوم :۔ مختارؔ ٹونکی اور ان کے ادبی کارنامے

اس باب میں مختارؔ ٹونکی کے ادبی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ۔نثری ادب میں مختار صاحب کی خدمات کے ذریعہ سے ان کے مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے

مختارؔ ٹونکی راجستھان کے معروف طنز و مزاح نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں ۔انھوں نے اردو ادب میں طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری اور انشائیہ نگاری میں بھی ایک مقام پیدا کیا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ اردو ادب میں ایک نئی صنف کے بھی موجد ہیں ۔ جس کو انھوں نے طنشائیہ کا نام دیا ہے ۔ ان کے طنشائیوں میں انشائیہ کی روانی اور شستگی ،طنز کا تیکھا پن اور مزاح کی چاشنی شامل ہے ۔

مختارؔ ٹونکی کے کلام میں بے تکلفی ، سادگی ،موضوعات کا تنوع ،فکر کی وسعت دیکھنے کو ملتی ہے ۔ان کے مضامین میں خاکوں کا رنگ ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ وہ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں ۔تنقید اور تحقیق کے میدان میں انھوں نے اپنی جولانیٔ طبع کا اظہار کیا ہے ۔ اس باب میں ان کی ان ہی ادبی خدمات کو پیش کیا گیا ہے ۔

باب چہارم :۔ مختارؔ ٹونکی بہ حیثیت شاعر

مقالے کے چوتھے باب میں مختارؔ ٹونکی کا بہ حیثیت شاعر مقام کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس سلسلے میں ان کی شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں ٹونک کے ادبی ماحول کا بھی جائزہ لیا گیا ہے ۔ جس سے مختار صاحب نے استفادہ کیا ہے جہاں پر شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں ۔ اس ماحول اور ادبی

محفلوں سے انھوں نے استفادہ کر کے تمام ہی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کا سرمایہ غزل اور نظم کی شکل میں تو موجود ہے ہی اس کے علاوہ قطعات نگاری، ماہیہ نگاری، ہائیکو نگاری نعت گوئی میں بھی اپنے جولانیٔ طبع کا اظہار کیا ہے۔ان کے ان ہی کلام کے ذریعہ ان کا ادبی مقام متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

باب پنجم :۔ مختؔار ٹونکی بہ حیثیت ادب اطفال نگار

مقالے کے اس باب میں مختؔار ٹونکی کی ادب اطفال کے تعلق سے ان کے ذریعہ کی گئی خدمات کا احاطہ کرنے کے کی کوشش کی گئی ہے۔مختار ٹونکی چونکہ ایک مدرس تھے اس لیے ان کو بچوں کی نفسیات اور ان کے مزاج سے بخوبی واقفیت تھی۔اسی وجہ سے وہ ادب اطفال پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اس کا اندازہ ان کے لکھے گئے مختلف مضامین سے چلتا ہے۔انھوں نے اس سلسلے میں بچوں کے لیے جاسوسی ناولٹ لکھے، سچی کہانیاں اور مضامین لکھے جن کے ذریعہ بچوں کی ذہنی تربیت اور اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں اپنے تمام ہی مضامین اور شاعری میں سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے تاکہ اطفالی ذہن اس کو آسانی سے قبول کر سکے۔

باب ششم :۔ ماحصل

ماحصل میں مختؔار ٹونکی کی ہمہ جہت شخصیت کے ساتھ مختلف ادبی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجموعی طور پر ان کے ادبی مقام و مرتبہ کو متعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔مختؔار ٹونکی ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں انھوں نے اردو ادب کے مختلف میدانوں میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔چاہے وہ نثری میدان ہو یا تنقید و تحقیق کا میدان، طنز و مزاح ہو یا پھر انشائیہ نگاری یا پھر اطفالی ادب ہو۔ہر میدان میں ان کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے جائزہ لیا گیا ہے اور اسی مناسبت سے ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتابیات :۔

مقالے کے آخر میں اس کی تکمیل کے لیے جن جن کتابوں ،مضامین ، رسائل و جرائد وغیرہ سے جو بھی استفادہ کیا گیا ہے۔اس کو مرتب ،مصنف ، مقام اشاعت اور سن اشاعت کے ساتھ حوالے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

CANDIDATE'S DECLARATION

I, hereby, certify that the work which is being presented in the thesis entitled **"Mukhtar Tonki Shakhsiyat aur Adbi Karname"** in partial fulfillment of the requirement for the award of the Degree of Doctor of Philosophy, carried out under the supervision of **Dr. Nadira Khatoon** and submitted to university of Kota, Kota represents my idea in my own words and where other ideas or words have been included, I have adequately cited and referenced the original sources. The work presented in this thesis has not been submitted elsewhere for the award of any other degree or diploma from any institution.

I also declare that I have adhered to all principles of academic honesty and integrity and have not misrepresented or fabricated or falsified any idea/data/fact/source in my submission. I understand that any violation of the above will cause for disciplinary action by the University and can also evoke penal action from the sources which have thus not been properly cited or from whom proper permission has not been taken when needed.

Date:
Place:

Sultana Fatima Ansari
Research Scholar

This is to certify that the above statements made by Sultana Fatima Ansari (Regd. No. RS/2031/18) is correct to the best of my knowledge.

Date :
Place : Kota

Dr. Nadira Khatoon
Research Supervisor

پیش لفظ

علم وادب کا گہوارہ کہی جانے والی ریاست ٹونک کی سرزمین میں ایسی عظیم الشان شخصیات پیدا ہوئی ہیں۔جنھوں نے علم وادب کوعروج بخشا اور دنیائے ادب میں ریاست ٹونک کا نام روشن کیا ہے۔دور حاضر کے بلند مرتبہ قلم کاروں میں مختؔار ٹونکی کا نام سرفہرست لیا جاتا ہے جوکہ گزشتہ پچاس برسوں سے علم وادب کی دنیا میں اپنی تخلیقی خدمات انجام دے رہے ہیں اسی کے ساتھ انھوں نے طنز ومزاح کے میدان میں راجستھان کا نام بھی روشن کیا ہے۔

مختؔار ٹونکی ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔وہ اپنی بے پناہ صلاحیت اور غیر معمولی ذہانت سے ایک طویل عرصے سے اپنے قلم کو رواں رکھے ہوئے ہیں اور دنیائے ادب میں طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے اپنا الگ مقام بنا چکے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے دیگر اصناف نثر مثلاً افسانہ، انشائیہ، خاکہ میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔جس میں عہد حاضر کے فکری تقاضوں اور جد جہد کو پیش کیا ہے۔ان اصناف کے علاوہ مختار صاحب نے تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی اپنے قلم کی روانی دکھائی ہے۔ جہاں پرانھوں نے نثری اصناف کے ساتھ تحقیق وتنقید کے میدان میں اپنے ہنر کا اظہار کیا ہے وہیں پر ادب اطفال پر بھی اپنی قابلیت کو ظاہر کیا ہے۔

مختؔار ٹونکی کے فکر وفن اور ان کے ادب میں مقام کے تعین اور ان کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لینے کی اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے۔جوکہ مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول :۔ ریاست ٹونک کا تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر:۔

اس باب میں ریاست ٹونک کے قیام سے لے کر اس کے تاریخی وتہذیبی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح سے اس ریاست کا قیام عمل میں آیا۔اور وہاں پر مسلم حکمرانی کے بعد جس طرح سے تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ جو ادبی آبیاری ہوئی اس پر روشنی ڈال گئی ہے۔

باب دوم :۔ مختؔار ٹونکی کے سوانحی کوائف

باب دوم مختؔار ٹونکی کے سوانحی کوائف پر مبنی ہے۔جس میں ان کے خاندان، ولادت تعلیم وملازمت پر معلومات کو ضبط تحریر میں لایا جائے گا۔اس سلسلے میں ان سے ملاقات کر کے حاصل شدہ معلومات اور ان پر مختلف رسائل وجرائد میں شائع مضامین جن میں خصوصی طور پر حیدر آباد سے شائع ہونے والے ماہنامہ رسالے ''شگوفے'' (جس میں موصوف پر گوشۂ مختؔار ٹونکی کے عنوان سے ایک گوشہ مختص ہے) سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

باب سوم :۔ مختؔار ٹونکی اور ان کے ادبی کارنامے

اس مقالے کے تیسرے باب میں مختؔار ٹونکی کے ادبی کارناموں کا احاطہ کیا جائے گا۔اور ان کی ادبی حیثیت کا تعین بھی کیا جائے گا۔نثر کے مختلف میدان خواہ وہ افسانہ ہو،تنقید ہو،انشائیہ ہو طنز ومزاح ہو یا پھر خاکہ نگاری ان کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ان کی ان ہی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔اس کے علاوہ خود ان کی ایجاد کردہ ایک نئی صنف بھی ہے جس کو انھوں نے طنشائیہ کا نام دیا ہے۔جس میں انشائیہ کی روانی، شگفتگی اور طنز کے تیکھا پن کے ساتھ مزاح کی چاشنی بھی شامل ہے۔ان تمام موضوعات کو شامل بحث کیا جائے گا۔

باب چہارم :۔ مختؔار ٹونکی بہ حیثیت شاعر

اس عنوان کے تحت مختؔار ٹونکی کی شاعرانہ حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی۔کیونکہ ان کا تعلق ادبی شہر ٹونک سے ہے جہاں شعری وادبی فضا تھی۔اس ادبی ماحول کی وجہ سے ٹونک میں نامور شعرا کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔مختؔار ٹونکی ان شعری محافل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔جس کا اثر ان کی فطرت پر بھی پڑنا تھا۔ان کا شعری سرمایہ غزلیات اور منظومات کی شکل میں موجود ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے شاعری کی دیگر اصناف قطعات، رباعیات، ماہیئے، دوہے، ہائیکو، چار بیت وغیرہ بھی کہے ہیں۔ان کی ان ہی شعری خدمات کا جائزہ اس باب میں لیا جائے گا۔

باب پنجم :۔ مختار ٹونکی بہ حیثیت ادب اطفال نگار

اس مقالے کے آخری باب میں ادب اطفال کے حوالے سے ان کی نثری وشعری خدمات کا جائزہ لیا جائے گا اور اس کے بعد ان کا مقام ومرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

چونکہ وہ ایک مدرس تھے اور بچوں کی ذہنی ونفسیاتی کیفیات کو وہ بخوبی سمجھتے ہیں جس کا اندازہ ان کے مضامین اور ادب اطفال سے لگایا جاسکتا ہے۔اس سلسلے میں ان کی ادب اطفال کے تعلق سے کی گئی ادبی خدمات (شعری ونثری) کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

باب ششم :۔ ماحصل

ماحصل میں اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ اس مقالے میں مختار ٹونکی کے ذریعہ کی گئی ادبی خدمات کا نچوڑ پیش کیا جائے گا۔

اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے میں سب سے پہلے اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتی ہوں۔اس کے بعد میں اپنی استاد محترمہ ڈاکٹر نادرہ خاتون صاحبہ کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ جب اس کام کے سلسلے میں ان سے مشورہ کیا تو انھوں نے موضوع کے تعلق سے بے لوث شفقت بھری رہنمائی کی۔اس تعلق سے انھوں نے اپنی بے پناہ محبت، رہنمائی، شفقت اور گاہے بگاہے حوصلہ افزائی کے ساتھ اپنی نگرانی میں اس مقالے کی تکمیل کرائی۔اللہ ان کو جزائے خیر دے اور صحت مند رکھے۔(آمین)

اپنی استاد کے علاوہ میں مختار ٹونکی صاحب کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس مقالے کے مواد کی فراہمی میں میری ہر ممکن مدد کی۔ان کے علاوہ محترمہ ڈاکٹر حسن آرا صاحبہ کی بھی دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے ہر ممکن میری مدد اور رہنمائی کی۔

اساتذہ کے علاوہ میں اپنے ان تمام احباب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے مجھے اس سلسلے میں مفید مشورے دیئے اور میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ان کے ساتھ ہی اپنے والدین جناب عابد حسین انصاری صاحب اور والدہ مہر النساء صاحبہ کی بے انتہا ممنون ہوں کہ انھوں نے نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی

بلکہ میری ہر خواہش کی تکمیل کے لیے ہر لمحہ تیار بھی رہے ۔ یہ ان کی دعاؤں کا ہی نتیجہ ہے میں آج اس مقام کو حاصل کر سکی ہوں ۔ اسی کے ساتھ مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ میں آج اپنے دادا جناب عبد الحمید صاحب انصاری مرحوم کی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکی ہوں ۔

اگر اپنی بڑی بہن سلمٰی فاطمہ انصاری اور چھوٹی بہن رائلہ فاطمہ انصاری اور بھائیوں زین العابدین ، عادل ، مزمّل ، عدنان اور فیضان کا ذکر نہ کروں تو یہ ان کی حق تلفی ہوگی میں ان کی بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے عملی تعاون سے میری مشکلات کو آسان کر دیا ۔ اللہ ان کی اس نیکی کو قبول فرمائے ۔

(آمین)

سلطانہ فاطمہ انصاری
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو
کوٹہ یونیورسٹی (کوٹہ)

فہرست ابواب

عنوان صفحہ نمبر

☆ باب اول ---------- ۱

ریاست ٹونک کا تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر

☆ باب دوم ---------- ۱۹

مختؔار ٹونکی کے سوانحی کوائف

☆ باب سوم ---------- ۳۹

مختؔار ٹونکی اور ان کے ادبی کارنامے

☆ باب چہارم ---------- ۹۵

مختؔار ٹونکی بہ حیثیت شاعر

☆ باب پنجم ---------- ۱۶۰

مختؔار ٹونکی بہ حیثیت ادب اطفال نگار

☆ باب ششم ---------- ۱۸۷

ماحصل

☆ تلخیص ---------- ۱۹۳

☆ کتابیات ---------- ۲۰۴

باب اول

ریاست ٹونک کا تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر

باب اول

ریاست ٹونک کا تاریخی ،تہذیبی اور ادبی پس منظر

ہندوستان جنوبی ایشیاء کا سب سے بڑا ملک ہے جس میں ۲۸ صوبے اور ۹ مرکزی ریاستیں ہیں ۔ان ۲۸ صوبوں میں راجستھان رقبہ کے اعتبار سے سب سے بڑا صوبہ مانا جاتا ہے۔اس صوبے کے محل وقوع کے اعتبار سے اس کے مغرب میں پاکستان اور جنوب مغرب میں گجرات ،جنوب مشرق میں مدھیہ پردیش اور شمال میں ہریانہ اور اتر پردیش ہیں ۔

صوبہ راجستھان کو قدیم زمانے میں راجپوتانے کے نام سے جانا جاتا تھا۔آزادی کے بعد جب ملک کی مختلف ریاستیں عظیم ہندوستان کا حصہ بن رہی تھیں تو اس وقت راجپوتانے کی بھی مختلف راجپوت ریاستیں اپنے آپ کو اس کا حصہ بنا رہی تھیں چنانچہ ۳۰ رنومبر ۱۹۵۶ء کے بعد راجپوتانے کی مختلف ریاستوں کے راجستھان سنگھ میں ضم ہونے کے بعد اس کو راجستھان کا نام دیا گیا۔اور جے پور کو راجستھان کا صدر مقام بنایا گیا۔

تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہاں پر راجپوتانے سے قبل قبائلی حکمرانی تھی ۔جنھوں نے اپنے اپنے علاقوں کے نام اپنے خاندان ،رقبہ اور بولی کے مطابق کر لئے تھے۔عہد برطانیہ میں راجپوتانہ نام دیا گیا اور اس راجپوتانے کو رجواڑا بھی کہا جاتا تھا جو خاص طور پر اپنی رنگا رنگ تہذیب ،تاریخ اور شجاعت وقربانی کے لیے مشہور ہے۔ چاہے وہ اجمیر کے چوہان راجپوت ہوں یا پھر میواڑ کے مہارانہ کمبھا یا پھر مہارانا پرتاپ ۔مردسورماؤں کے علاوہ بہادری اور شجاعت وقربانی کا خمیر یہاں کی خواتین میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی بہادری اور شجاعت اور ایثار وقربانی کی داستانوں سے یہاں کا ذرہ ذرہ معمور ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہاڑی رانی ،رانی پدمنی اور پنا دھائے جیسی بہادر خواتین نے نہ صرف راجستھان کی تاریخ میں بلکہ ملک کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا ہے اور اپنا نام تاریخ کے اوراق میں سنہرے

الفاظ سے لکھوایا ہے۔اس کے علاوہ یہاں کی درگا ہیں، میلے، پہاڑ جھیلیں اور قدرتی مناظر نے یہاں کے حسن میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔

آزادی ملک کے وقت یہاں پر کل ۱۹ ریاستیں اور کشن گڑھ، نیمرانہ وغیرہ ٹھکانے تھے۔راجستھان کی تشکیل کے وقت یہاں کی دیسی ریاستوں میں جے پور، جودھ پور، جیسلمیر، بیکانیر، الور، بھرت پور وغیرہ خاص تھیں۔ان تمام راجپوت ریاستوں میں اکلوتی مسلم ریاست ٹونک تھی۔ یہ ریاست بناس ندی کے کنارے پر راجدھانی جے پور سے سوکلومیٹر کے فاصلے پر آباد ہے۔جو علمی اعتبار سے بھی کافی اہمیت کی حامل رہی ہے۔اس ریاست کی تاریخ بھی دو ہزار سال پرانی ہے۔ جہاں پر کئی مسلم و غیر مسلم حکمرانوں نے حکومت کی ہے۔ یہ بھی دیگر ریاستوں کی طرح سے آزادی کے بعد یکم مئی ۱۹۴۸ء کو راجستھان کا حصہ بن کر ایک ضلع کے طور پر پہچانی گئی۔ راجستھان کا حصہ بن جانے کے بعد وقتی طور پر اس کا نظم ونسق وہاں کے سابق حکمرانوں (نوابوں) کے پاس ہی رہا۔اس ریاست کے چھ پرگنے تھے جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ ٹونک ۲۔ علی گڑھ ۳۔ نمبا ہیڑا

۴۔ سرونج ۵۔ چھبڑا ۶۔ پڑاوا

علی گڑھ اور نمبا ہیڑا راجپوتانے کے اور چھبڑا اور سرونج مرکزی ہندوستان کے شعبے میں تھے۔ ریاست ٹونک کا کل رقبہ ۲۵۵۳ مربع کلومیٹر تھا۔اس ریاست کی خاصیت یہ تھی کہ یہ انگریزوں کو خراج نہیں دیتی تھی۔[۱]

تاریخی پس منظر

ٹونک مختلف تاریخی وتہذیبی روایتوں کا سفر طے کرتے ہوئے موجودہ صورت حال میں عالم وجود میں آیا۔ٹونک ہندی زبان میں نوک دار پہاڑی کو کہتے ہیں۔ رسیا کے نوک دار پہاڑی کے دامن میں بسا ٹونک ''ٹونکرا'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔جس کے آباد ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ زمانۂ قدیم میں دہلی کے راجہ کا بھائی مٹن پال تنورا اپنے بھائی سے تکرار ہونے کی وجہ دہلی چھوڑ کر ٹونک میں آ گیا تھا۔کئی دن

تک یہاں پر قیام کرنے کے بعد اپنے بھائی کے بلوانے پر واپس دہلی گیا تو ٹونک کو اپنے ملازم رام سنگھ کے حوالے کر کے اس کو بسانے کا حکم دیا۔ رام سنگھ نے ۲۴ / دسمبر ۹۴۶ء میں رسیا کے دامن میں ٹونکرا کی بنیاد رکھی مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف ''جائزہ زبان اردو'' میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

> ۹۴۶ء کا واقعہ ہے کہ مٹن پال راجہ دہلی سے رام سنگھ ناراض ہو کر راجپوتانے چلے آئے اس نے اس کو انچے میں نیچے، جسے رسیا کی ٹیکری کہتے ہیں ایک قصبہ بسایا جو کہ ٹونک کے نام سے مشہور ہوا۔ ۲

تاریخ ٹونک کے متعلق استاد اصغر علی خان آبرو اپنی مرتب کردہ تصنیف ''تاریخ محمد آباد'' میں لکھتے ہیں :

> ''سمبت ۱۰۰۳ وکرمی میں شنی وار مسمیٰ ٹنڈن پال تنور برادر راجہ دہلی سے بوجوہ کسی سخت رنجش کے اپنے بھائی سے جدا ہو کر اس جگہ وارد ہوا اور چند روز یہاں پر قیام کیا۔ پھر ٹنڈن پال کو راجہ دہلی نے اپنے پاس بلا لیا۔ اور وقت روانگی اپنی طرف سے ٹنڈن پال نے مسمیٰ رام سنگھ ملازم خود کو بنا ور آبادی قصبہ مامور کیا اور اس کے دامن کو انچہ میں کہ فی زمانہ اس کو رسیا کی ٹیکری کہتے ہیں۔ حسب الحکم آقائے خود قصبہ مامور کرنے کے ''ٹوکڑا'' نام رکھا۔ اور اس کی نظر تذکرہ یہ ہے کہ نتیجہ نوک دار کو ٹوک کہتے ہیں اس وجہ سے اس کی آبادی زریب (نیچے) ٹکرے کے نام سے مشہور ہوئی'' ۳

ابتدا میں ٹونک میں تنور قوم قابض تھی ۔ پھر اس کے بعد اس پر چوہانوں نے راج کیا۔ سمبت ۱۱۳۵ میں یہ علاقہ سولنکی کے حصے میں آیا۔ اس کے بعد سمبت وکرمی ۱۲۱۲ میں مطابق ۱۱۵۹ء میں ساتوجی راجپوت جوگوت نے ٹوکڑا کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے اس پر حملہ کر دیا تو گوبند راج سولنکی نے رن میں مار کر ٹوڈہ کو ٹوکڑا میں ملا لیا۔ علاؤالدین خلجی کے دور میں ۱۳۵۶ء میں مہین داس آہیر ساکن بلرام پور کو ٹونک کا حکمراں بنایا جس نے ٹونک کی آبادی میں اضافہ کیا ۔ اس کے بعد کئی حکمرانوں نے ٹوکڑے میں حکمرانی کی جس میں

روپال ،کھیم راج، راؤ ڈونگر جی اور راؤ رتن ڈونگر جی اہم ہیں۔

سمبت ۱۷۹۹ء وکرمی میں رائے سنگھ سسو دیہ ٹوکڑے پر متصرف ہوا تو اس کے عہد میں ہی اس نے اپنے علاقے کو ٹونک کا نام دیا گیا۔ سمبت ۱۷۹۹ء وکرمی میں مادھوسنگھ گدی نشین ہوا تو اس نے اپنی مدد کے لیے راؤ ملہار ہولکر کو چوالیس لاکھ روپیہ اور ٹونک ورام پورہ، علی گڑھ پرگنے دے دیے اور ایک سال کے بعد ان سے واپس لے لیا۔ اس کے بعد تکوجی ہولکر، کاشی راؤ، ہولکر اور جسونت راؤ ہولکر نے ٹونک پر قبضہ کر لیا۔

سمبت ۱۸۵۹ء وکرمی مطابق ۱۸۵۴ء میں کرنل پیروصاحب نے ٹونک اور رام پورہ، علی گڑھ کو فتح کر کے سری بال کشن راؤ کو سونپ دیا، اس کے بعد کئی حکمرانوں کا شہر ٹونک پر قبضہ رہا اور آخر میں ۱۸۳۶ء میں یہ علاقہ نواب امیر الدولہ کے تصرف میں آیا۔

نواب امیر الدولہ کو ٹونک کا بانی کہا جاتا ہے۔ امیر خاں ایک بہادر سپاہی اور جنگ جو تھے۔ ان کی دلیری کی وجہ سے ٹونک کی تاریخ میں ان کا الگ مقام ہے۔ ان کو شجاعت، دلیری اور جنگ کی معرکہ آرائی ان کے دادا سے وراثت میں ملی تھی جو کہ بونر وال افغانستان سے ہندوستان آ کر مراد آباد کے کٹیہار (جو کہ روہیل کھنڈ کے بڑی تحصیل میں تھا) میں آباد ہوئے تھے۔ یہاں پر سکونت کے بعد محمد علی خاں روہیلے کی فوج میں شامل ہوئے اور اپنے روایتی جنگی جوہر سے اپنا مقام بنا کر برتری حاصل کی۔ ان کے برخلاف امیر خان کے والد صاحب ایک متقی اور پرہیز گار شخص تھے جنھوں نے فقیرانہ زندگی کو اختیار کیا۔ امیر خان میں ان کے دادا اور والد دونوں کے اوصاف موجود تھے۔

نواب امیر خاں ٹونک کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان ہی کی بدولت ریاست ٹونک سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے تاریخ میں ایک مقام رکھتی ہے۔ نواب امیر خان بیس سال کی عمر میں اپنی قسمت کو آزمانے کے لئے گھر سے نکل گئے تھے۔ اور اپنی محنت اور قابلیت کے بل پر بھوپال کے نواب غوث محمد خان کے یہاں پر ملازمت کے لیے گئے۔ مگر وہاں پر ان کو ناکامی ملی۔ بعد میں جب نواب نے نوکری کا پیغام دیا تو امیر خاں نے منع کر دیا اور اپنی الگ ایک فوج تشکیل دی جو رفتہ رفتہ اتنی مضبوط ہو گئی کہ وہ جس لڑائی

میں بھی شامل ہوتے یا ان کی فوج کسی کمزور فوج کی مدد کرتی تو ان کی بدولت کامیابی ملتی تھی۔مگر افسوس ہے کہ ان کی اس بہادری اور امداد کو لوٹ کا نام دیا گیا۔ان ہی خصائل اور عادات کی بدولت ان کو ٹونک ریاست کو بانی تصور کیا جاتا ہے۔ان کی اسی بہادری کی وجہ سے ہی ان کو انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں میں ٹیپو سلطان کے بعد دوسرا حکمراں تسلیم کیا جاتا ہے۔

مختار شمیم ان کی اس مجاہدانہ زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''امیر خاں کی مجاہدانہ زندگی کی جھلیاں دیکھی جائیں تو حقائق کھل کر سامنے آتے ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ سلطان ٹیپو کے بعد امیر خان ہی وہ واحد شخص تھے جنھوں نے راجہ ہولکر کی مدد سے انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں آزادی کے ابتدائی مشن کو لبیک کہا تھا اور جس قدر ممکن ہوسکا وہ انگریزوں کے خلاف برابر لڑتے رہے ان پر یہ الزام لگانا کہ لوٹ مار اور غارت گری ان کا پیشہ تھا سراسر بہتان ہے اور تاریخی حقائق کی پردہ پوشی ہے''[۴]

امیر خان کی طاقت ور فوج سے انگریزوں کی حکومت میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ان کے اس اقتدار کے دیکھتے ہوئے حکومت نے ان کے پاس صلح کا پیغام بھیجا کیونکہ انگریز ان کی قابلیت اور استعداد کا اندازہ لگا چکے تھے۔بقول مختار شمیم:

''انگریز اس بات سے باخبر تھے کہ پنڈاروں کی قوت بڑی زبردست ہے۔لہٰذا انھوں نے نواب امیر خان کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ انگریزوں سے مشروط طور پر صلح پر آمادہ ہوجائیں۔یعنی یہ کہ مہاراجہ ہولکر نے جو علاقے ان کو دیئے وہ امیر خان لے لیں اور جو علاقے انھوں نے زبردستی حاصل کیے ہیں ان سے دستبردار ہوجائیں امیر خان نے حالات کو دیکھتے ہوئے صلح نامہ پر دستخط کردئے۔[۵]

فوجی استعداد جنگی قوت اور قابلیت کے اعتبار سے امیر خان کی شخصیت کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ریاست ٹونک کے نظم ونسق، تہذیبی وثقافتی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ امیر خاں کا عہد حکومت ۱۸۱۷ء تا ۱۸۳۴ء رہا تھا۔

نواب امیر خان کے بعد ان کے بیٹے نواب وزیر الدولہ ان کے جانشین بنے۔ وہ امیر خاں کے برعکس متقی اور پرہیز گار شخص تھے اور شریعت کے پابند تھے اس کے ساتھ ہی وہ ریاست کے انتظامات بھی خود ہی دیکھا کرتے تھے۔ وہ عوام کے جذبات کو بھی خاص خیال رکھتے تھے انھوں نے دہلی میں شاہ عبد القادرؒ کی رہبری میں تعلیم حاصل کی تھی اسی وجہ سے وہ اسلامی قانون اور روایتوں کے پابند، دین سے محبت کرنے والے شخص کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ انگریزوں کے پالیسی سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی ریاست کو انگریزوں سے بچانے اور امن وامان کو قایم رکھنے کی غرض سے انگریزوں کے روابط بنائے۔ ان کے ہی دور حکومت غدر کا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ چونکہ نواب صاحب انگریزوں کے وفادار اور حمایتی تھے۔ اس وجہ سے ان کو قانونی حق دیا گیا۔ جس کے تحت نواب کے خاندان میں اولاد نہ ہونے پر (قانون متبنیٰ یعنی گود لینے کا قانون) موافق نذرانہ دئے بغیر بھی گود لے سکتے ہیں۔ نواب وزیر الدولہ کا عہد حکومت ۱۸۳۴ء تا ۱۸۶۴ء تک رہا۔

نواب وزیر الدولہ کے بعد ان کے بیٹے نواب محمد علی خان (۱۸۶۵ء تا ۱۸۶۷ء) نے بھی اپنے والد کے نقش پر چلتے ہوئے عوام کی ہر ضرورت اور آسائش کا خیال رکھا۔ ان کے دور میں خاص طور پر تعلیم اور تعمیر پر توجہ دی گئی تھی۔ نواب محمد علی خان کے دور میں سکہ جاری کیا گیا جن پر یہ عبارت کنداں تھی۔

ایک طرف :۔ ''درعہد سلطنت ملکہ معظّمہ رفیع الدرجہ وکٹوریہ ضرب سرونج''

دوسری طرف:۔ ''یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خان صاحب صولت جنگ''[۲]

نواب محمد علی خا کے عہد میں تین جنگیں ہوئیں جو کہ ریاست ٹونک کی اہم جنگ مانی جاتی ہیں۔ محمد علی خان انگریزوں کے مخالف تھے اور انگریز ان کی عوامی استعداد دیکھ کر پریشان تھے۔ اس لیے انھوں نے اس

جنگ سے فائدہ اٹھا کر نواب صاحب کو بنارس میں نظر بند کر دیا۔ نواب محمد علی خاں کی نظر بندی کے بعد نواب ابراہیم علی خان مسند نشین ہوئے۔

نواب ابراہیم علی خاں (۱۸۶۸ء تا ۱۹۳۱ء) کا دور ہا۔ ان کی کم عمری کے باعث ان کے دادا نے ذمہ داری لے کر ایک کونسل ان کی مدد کے لیے مقرر کر دی۔ ۲۵ سال کی عمر میں نواب ابرہیم علی خاں نے ریاست کی باگ ڈور سنبھالی ۔ ان کا دور فن کارانہ حیثیت سے ایک اہم دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں فن تعمیر کے کارنامے بھی انجام دیے گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے زمینی کام کے لیے الگ الگ محکمہ قایم کئے۔ جاگیرداروں کے قرض دینے کی حدود کو مقرر کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے پولیس انتظامیہ کی اصلاح کے لیے ۱۹۱۵ء میں مسٹر ہانٹس کا تقرر بھی کی۔ مسٹر ہانٹس نے ٹونک میں کئی اصلاحی کام بھی انجام دیے۔ ان اصلاحی کاموں کے علاوہ انھوں نے اردو زبان ادب کی بھی آبیاری کی۔ ابتداء میں ٹونک میں سرکاری کام کاج فارسی زبان میں ہوا کرتے تھے۔ تو دھیرے دھیرے اردو کا چلن عام ہوا۔

ابراہیم علی خان کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خان کا دور آیا۔ جو کہ ٹونک کی تاریخ میں سنہرا دور کہلاتا ہے۔ انھوں نے اپنے اسلاف کی طرح سے ٹونک کی ترقی کے لیے کئی اہم خدمات انجام دیں۔ ان کے سترہ سالہ دور اقتدار میں کئی مفید اور تعمیری کام ٹونک اور اس کے پرگنوں میں ہوئے تھے۔ جن میں ٹونک میں بناس ندی پر فریزر برج، شہر میں گھنٹہ گھر، بجلی گھر اور سعادت اسپتال، سعادت اسپتال نمبا ہیڑا کے ساتھ سرونج میں سعادت اسکول کی تعمیر وغیرہ نمایاں کام ہیں۔ ان کے ہی دور میں آفات سماوی کا بھی دور رہا۔ جن میں انھوں نے بہتر طریقے سے بروقت اور دانش مندانہ تدابیر اختیار کر کے انتظامات کئے۔ آپ رعایا کے لئے ہمدرد اور منصف مزاج تھے۔ نواب صاحب کا انتقال مئی ۱۹۴۷ء کو ہوا۔

نواب سعادت علی خاں کے دور میں دوسری جنگ عظیم ہوئی تو اس دوران انھوں نے مسٹر وائزر کے ساتھ مل کر ریاست میں اناج اور دوسری ضروریات کا انتظام کیا اور شاہی سکہ کو بند کر کے آزادی کا سکہ جاری کیا۔ نواب صاحب نے ایک انتظامیہ کونسل بھی بنائی جس میں تعمیرات اور محکمہ جنگلات، جنگی و آب کاری محکمہ

مجلس عام، میونسپلٹی، پنچایت اور آزاد عدلیہ قائم کی۔

نواب سعادت علی خان کے انتقال کے بعد فاروق علی خاں بہادر صولت جنگ گدی نشین ہوئے۔ ان کے دور میں ہی انگریزوں کے خلاف خود مختاری کی مانگ زور پر تھی اور اسی دور میں نائب صدر کا نام تبدیل کر کے وزیر اعظم رکھا گیا اور رحمان بخش کو پہلا منسٹر بنایا گیا۔ ان کے دور میں ملک آزاد ہو گیا اور ریاست ٹونک ہندوستان کے صوبے راجستھان کا ایک حصہ بن گئی۔ ہنومان سنگھ اس دور کے حالات کو بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب میں یوں رقم طراز ہیں کہ

''یہ وہ دور تحا جب ہندو اور مسلمان دونوں سماجی اور سیاسی مشکلوں سے پریشان تھے ہندوؤں کو خوف تھا کہ کہیں نواب پاکستان سے الحاق نہ کر لیں۔ اس لئے بہت سے ہندو افسران شہر چھوڑ کر دیولی، نصیر آباد اور اجمیر کی طرف کوچ کر گئے۔ لیکن جب نواب نے ہندوستان میں ہی رہنے کا اعلان کیا تو الور، بھرت پور، اجمیر، جے پور سے کافی مسلمان ٹونک آ بسے۔ نواب نے ان کی رہائش کا معقول انتظام کیا۔ روزگار کے مواقع فراہم کیے اور اپنی ذاتی آمدنی سے فاروق نگر نامی ایک بستی بھی بسائی جو کہ ان دنوں قصبہ کی حیثیت رکھتی ہے''۸

آزاد ہندوستان کی ریاست ٹونک میں نواب اسماعیل علی خاں بہادر صولت جنگ ۱۴ر فروری ۱۹۴۸ء کو تخت نشین ہوئے۔ ان کا دور محض تین ماہ کا ہی رہا۔ مئی ۱۹۴۸ء میں راجپوتانے کی گیارہ ریاستوں کے ضم کر کے راجستھان یونین بنائی گئی۔ ان ریاستوں میں ریاست ٹونک بھی شامل تھی۔ ریاست ٹونک کے خاتمے پر محمد اعجاز خان تاریخ ٹونک میں لکھتے ہیں کہ

''چنانچہ ٹونک کو ایک ضلع کی حیثیت دی گئی۔ جس میں علی گڑھ، نینوا اور اندر گڑھ کی تحصیلیں شامل کی گئیں۔ اس طرح سے ایڈمنسٹریٹر کا عارضی دور کا خاتمہ ہو گیا اور دو ممبران کونسل نے اپنی ریاست اور کونسل کو خدا حافظ کہا اور رئیس وقت نے تین

ہزار کا ماہانہ وظیفہ قبول کر کے ریاست کے انتظامی امور سے دست برداری حاصل کی'' ۹؎

﴾ تہذیبی پس منظر ﴿

کسی بھی علاقے کی سیاسی و اقتصادی، تہذیبی اور معاشرتی ماحول کو جاننے کے لیے اس زمانے کے گرد و پیش کے ماحول سے شناسائی ضروری ہے۔ کیونکہ ہر تہذیب و سماج اپنے ماحول کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس زمانے اور اس ماحول کی تہذیب کو اس زمانے کی تاریخ مانا جاتا ہے۔ ٹونک کی تہذیب وہاں کی مشرقی روایات کی آئینہ دار رہی ہیں۔ وہاں کی ثقافتی اور تہذیبی روایات کو جن بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے وہ وہاں کا تہذیبی اور ادبی سرمایہ ہیں۔

کسی بھی تہذیب کو سمجھنے اور جاننے کے لیے وہاں کے مقامی حالات، ماحول، موسم، طریق ہائے زندگی کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار اور عقائد وضع قطع کے ساتھ ساتھ وہاں کی زبان و ادب سے روشناس ہونا ضروری ہے۔ برناڈ لوئیس کے مطابق:۔

> ''کسی بھی تہذیب کی شائستگی یا ناشائستگی متعین کرنے کا ایک عمدہ پیمانہ اس تہذیب میں موجود مختلف عقائد کے درمیان مذہبی رواداری اور وجود باہمی کی خواہش کے موجود ہونے کو قرار دیا جاسکتا ہے'' ۱۰؎

ٹونک کی تہذیب اور معاشرت کو مذہبی رواداری کے پیمانے پر دیکھا جائے تو ٹونک کی تہذیب نے بلا شبہ گنگا جمنی تہذیب کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں اور ان کی حفاظت بھی کی ہے۔ یہاں کی تہذیب کو ہندو اور مسلم دونوں ہی نے پروان چڑھایا ہے۔ جس کے نمونے ہم کو ٹونک میں عہد بہ عہد نظر آتے ہیں جو کہ اتحاد و اتفاق کے بہترین نمونے ہیں۔ عیدالفطر کی تقریبات ہوں ہو یا پھر عیدالاضحیٰ کی تقریبات یا پھر تیج، گنگور اور ہریالی کے میلے سب ہی لوگ بڑے ہی جوش وخروش کے ساتھ مناتے ہیں۔ جہاں عیدین کے موقعوں پر جلوس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس موقع پر نکلنے والی عید کی سواری کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ یہ جلوس بڑی ہی شان سے نکالا جاتا تھا۔ جس میں اولاً ہاتھی پر ریاست کا جھنڈا ہوا کرتا تھا۔ اور سواری پر توپ خانے سے چھ توپ جلوس

میں شامل کی جاتی تھیں جن کے ساتھ چھ چھ پیٹیاں نمائش کے طور پر سجائی جاتی تھیں ۔ رسالہ سواروں کی پشت پر نواب صاحب کی سواری ہوتی تھی اور ان کے پیچھے اہل خاندان کی سواری ہوتی تھی ۔ بقول عبدالمعید خان

''ریاست کی اس فوجی پلٹن کے پیچھے قلعہ معلیٰ پر مامور قلعہ کا بیڑا ہوتا تھا۔ان بیڑے والوں میں کسی کے ہاتھ میں بندوق ہوتی تھی تو کسی کے ہاتھ آری پرچم ہوتے تھے نواب صاحب جس سواری میں ہوتے تھے اس کے دائیں بائیں چنور ہلائے جاتے اور مورچھل جھلائے جاتے تھے۔نواب صاحب کی سواریوں کے پیچھے ریاست کے ملازم،اردلی، چوبدار، چاندی سونے کی چھڑیاں لیے ساتھ رہتے۔۔۔۔۔۔۔ بڑی شان وشوکت سے آراستہ ہوکر جلوس عیدگاہ کی طرف روانہ ہوتا۔[11]

ٹونک کی تہذیب وثقافت کو دیکھ کر یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہاں پر دونوں قومیں بھائی چارے کے ساتھ رہتی ہیں یہاں کے مندر مسجد اس بات کی شہادت ہیں کہ یہاں دونوں ہی مذہب کے لوگوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے۔

ٹونک شہر کی خوبصورتی میں چار چاند لگانے میں یہاں کی کوٹھیوں، باغات، محلات وغیرہ کی تعمیر کا خاص رول رہا ہے۔کالی ڈونگری پر بنی سرکٹ ہاؤس کی کوٹھی،عیدگاہ کی کوٹھی، پکے بند کی کوٹھی، کچے بند کی کوٹھی وغیرہ نوابوں کے سیر سپاٹے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ریاست سے قدیم تالابوں میں بائی راؤ تالاب، مانک راؤ تالاب ، تالاب علی گنج المشہور ، تلیاں ، تالاب، موتی باغ تالاب وغیرہ تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔اسی طرح سے یہاں کے بازاروں میں امیر گنج بازار،علی گنج بازار، وزیر گنج بازار وغیرہ مشہور ہیں۔ ہندو میلوں اور مسلم تہواروں میں دونوں مذہب کے لوگ شامل ہوتے۔اس کے علاوہ ٹونک میں کئی شکارگاہیں تھیں۔جن میں بندیڑا، کابرا وغیرہ خاص طور پر مشہور تھیں۔ جہاں پر ہرن، نیل گائے، خنزیر وغیرہ کی شکار کیے جاتے تھے۔

ریاست ٹونک میں عوام کے حقوق اور ان کی ضروریات کے تحت نوابان ٹونک نے سیاسی نظم ونسق کے

لیے چار جماعتوں کا انتظام کیا گیا تھا۔جن کے نام یہ ہیں مسلم لیگ، انجمن رعایائے ٹونک، جاں نثار پارٹی اور پرجا منڈل تھیں۔ یہ تمام جماعتیں رعایا کے حقوق اور انتظامات کے لیے قائم کی گئی تھیں۔ جن کا مقصد رفاہی اور عوامی کام کرنا تھا تاکہ سیاسی نظم میں کسی طرح کوئی پریشانی نہ ہو۔

اس کے علاوہ راجپوتانے کے اکلوتی مسلم ریاست ہونے کے ناطے یہاں پر قانون شریعت اور اس کے نفوذ اور اس کے عملی جامے کے لیے باقاعدہ ایک محکمہ بھی قائم کیا گیا تھا۔جس کو محکمہ شریعہ (عدالت شریعہ شریف) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ شرعی محکمہ اپنی عظمت اور علمی رفعت کے لحاظ سے نہ صرف ملک ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ممتاز اور مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں پر نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک سے یہاں تک کہ سعودی عرب تک سے بھی لوگ استفادہ کے لیے آتے تھے اور مفتیان کرام ان کے جوابات دیتے تھے ۔ٹونک کے اس مرکزی ادارے سے جوابات لے کر علماء کے اتفاقی دستخطوں اور مواہر کے ساتھ سائلین مفتیان کو بھیج دیا جاتا تھا۔ان سوال ناموں کی مع جوابات نقلیں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ان علمی اور فقہی معاملات کا ایک بڑا ذخیرہ عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک میں محفوظ ہے۔۱۲

چونکہ نوابان ٹونک علم دوست اور علم پرور کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں چنانچہ اس سلسلے میں ان کی جانب سے کی گئی عملی خدمات محتاج بیان نہیں ہیں۔اسی مقصد کے تحت ریاست میں تعلیم کے حصول کے لیے بھی کئی تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ان مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس کے علاوہ وہاں پر فلسفہ، منطق، احادیث اور ریاضی کی تعلیم بھی فراہم کی جاتی تھی۔اس دور میں مدرسۃ العلوم ناصریہ، دارالعلوم امیریہ اور دارالعلوم خلیلیہ خاص طور پر علمی مراکز تھے۔

مدرسہ دارالعلوم ناصریہ اور مدرسہ دارالعلوم خلیلیہ دونوں مدرسے صاحبزادہ عبدالرحیم خاں اور خلیل حکیم برکاتی کی سرپرستی میں قائم ہوئے تھے۔ان میں مدرسہ خلیلیہ کو خاص اہمیت حاصل تھی اس مدرسہ میں نہ صرف ملکی بلکہ بیرون ملک مثلاً سمرقند، بخارا، کابل سے بھی طالب علم حصول علم کے لیے آتے تھے۔ وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ ٹونک کی عظمت رفتہ میں کمی آتی چلی گئی اور وہ مدارس اپنا وجود کھونے لگے اور دینی تعلیم کے

علاوہ عصری تعلیم کے لیے بھی اسکول اور کالجز کا قیام عمل میں آیا۔ رفتہ رفتہ ان مدارس کی جگہ اسکول اور کالجوں نے لے لی۔ تو پھر ریاستی عہد ہی میں پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا۔

نواب امیر خان کے عہد میں تہذیبی اور معاشری ماحول کے ساتھ ہی دینی رجحان کی طرف خاص توجہ تھی۔ جس میں جشن عید میلا دالنبی کو خاص مقام حاصل تھا۔ چونکہ نواب امیر خان ایک درویشانہ طبیعت کے مالک تھے اور ان کے لشکر میں کئی صوفی شامل تھے۔ ان میں سید احمد شہید بریلوی جو کہ لشکر کے نگراں تھے ان کی ہی سرپرستی میں نوابوں کے مذہبی رجحان اور عقیدے کو تقویت ملی۔ ان کی وفات کے بعد لشکر کو ٹونک میں بلایا۔ جو کہ ٹونک میں ''قافلہ'' کے نام سے آباد ہوا۔ ان کی ہی بدولت ٹونک میں مذہب کی تبلیغ نے زور پکڑا۔ نواب صاحب کے دور جشن عید میلا دالنبی بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا تھا۔ اور یہ جشن ایک سے سات دن تک منایا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ تیر اندازی، تلوار بازی، پہلوانی یہاں کی تہذیب کا اہم حصہ تھیں۔ فن چار بیت بھی ٹونک کی قدیم صنف ہونے کے ناطے اہم حصہ ہی میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں دو پارٹیاں آمنے سامنے بیٹھ کر مقابلہ کرتی ہیں جو کہ گیت کے انداز میں ہوتا ہے۔ یہ وقت گزاری کا ایک دلچسپ ذریعہ تھا جو کہ موجودہ دور میں بھی قائم ہے۔

ادبی پس منظر

ٹونک تہذیبی وسماجی وسیاسی ماحول کے ساتھ ساتھ ادبی ماحول بھی اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ تہذیب میں تو تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں لیکن ادب اپنے نقوش ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتا ہے اور ان ہی نقوش سے وہاں کی تہذیب اور معاشرت سے آگاہی ملتی ہے۔

اس ریاست میں تہذیبی ومعاشرتی فروغ وہاں کے نوابان کی وجہ سے ہوا ہے۔ مذہبی روایت کے ساتھ ساتھ علم وادب کے اعتبار سے بھی ٹونک ریاست کا شان دار ماضی رہا ہے۔ جہاں پر علم وادب کی ترقی اور اس کی ترویج میں وہاں کی مذہبی محفلوں اور خانقاہوں اور تنظیموں کا اہم رول رہا ہے۔

اس ریاست میں اگر ادبی سرگرمیوں کی بات کی جائے تو اس کی ابتدا نواب امیر خان کے فوجی لشکر سے ہی مانی جاتی ہے۔ امیر خان کا فوجی لشکر نہ صرف معرکہ آرائی میں کامل الفن تھا بلکہ شاعری کے میدان میں بھی وہ طاق تھا۔ اس میں فرصت کے لمحات میں ادبی محفلیں جمتی تھیں۔ ان کے اس ادبی ماحول میں فارسی کا رنگ تغزل بھی شامل تھا۔

ٹونک میں نواب امیر خان کی آمد سے پہلے ہی شعروشاعری کی شمع روشن ہو چکی تھی۔ شمیم ٹونکی کے مطابق

> ''ریاست ٹونک میں شعروادب کی شروعات تو نواب امیر الدولہ کی آمد سے قبل ہی ہو چکی تھی۔ قاضی شجاع الدین، معراج الحق تجلی، حافظ محمد یوسف، مولانا محمد ہاشم اور مرمت خاں مرمت شعروادب کی شمعیں روشن کئے ہوئے تھے یہ ادیب وشاعر راجستھان کے اولین ادیب وشاعر ہیں، ٹونک سے پہلے راجستھان کے کسی بھی شہر میں شعروادب کا کوئی چرچا نہ تھا'' [۱۳]

اگر چہ یہاں پر شعروسخن کی شمع پہلے ہی روشن ہو چکی تھی لیکن اس شمع کا علم وادب کا روشن چراغ بنانے میں نواب امیر خاں اور ان کے لشکر کا ہاتھ تھا۔ ان کا کارواں علماء، فضلاء، شعراء، فقراء کی چلتی پھرتی انجمن تھا۔ جوش ملیح آبادی کے دادا فقیر محمد خاں گویا بھی اسی لشکر میں شامل تھے۔

امتداد زمانہ کے ساتھ ٹونک کی ادبی تاریخ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں سے بھی کافی حد تک متاثر ہوئی۔ غدر کا یہ سانحہ ایک ایسا سانحہ تھا۔ جس میں کی وجہ سے پورے ملک میں افراتفری کا ماحول ہر طرف تباہی اور بربادی کی داستان بیان کر رہا تھا۔ زمین تنگ کی جا رہی تھی تو متعدد حضرات اپنے سکون اور معاش کی تلاش میں اپنے مقامات سے ہجرت پر مجبور ہو گئے کچھ نے مشرق میں عظیم آباد اور لکھنو کی طرف رخ کیا تو کچھ نے بھوپال اور رام پور میں عافیت پائی۔ راجپوتانے کا علاقہ اس دور میں قدر غنیمت تھا تو کچھ لوگ آگے بڑھ کر ادھر بھی آئے۔ الور، بھرت پور اور جے پور ریاستوں کے علاوہ یہاں کی اکلوتی مسلم ریاست ٹونک بھی تھی جہاں پر اہل علم حضرات وارد ہوئے تو ان کی آمد سے شعروسخن کی محفلیں جمنے لگیں۔

نواب وزیرالدولہ کی عہد میں شعروسخن کی ابتدا ہو چکی تھی۔ان کے ہی عہد میں متعدد اہل علم حضرات اور صاحب علم وفن یہاں پر آئے۔اور یہاں کے ادبی ماحول کو اپنی علمی ضیاء سے منور کرنے لگے۔ساتھ ہی نوابان ریاست بھی اپنی علم دوستی اور ذوق کی وجہ سے ان اہل علم حضرات کی سرپرستی اور نگرانی کر رہے تھے۔تو اس دور میں ٹونک شعروسخن کے ساتھ علم وادب کا مرکز بن گیا تھا۔ ڈاکٹر قمر جہاں بیگم کے مطابق

''نواب صاحب نے علماء کی ایک جماعت بنائی تھی اس کے اراکین نے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۹ء تک تاریخ احمدی، مخزن احمدی اور وقائع احمدی وغیرہ مختلف کتابیں تصنیف وتالیف کیں جو کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی سوانح اور تحریک آزادی پر مشتمل ہیں۔ان میں تاریخ احمدی جلد اول حضرت سید احمد شہید کی تحریک آزادی اور ان کے جہاد کی مکمل تاریخ ہے'' ۱۴

نواب وزیرالدولہ کی شان وشوکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں مومنؔ اور غالبؔ نے بھی ان کی شان میں قصیدے لکھے تھے۔غالب نے دو قصیدے نواب صاحب کی مدح میں لکھ کر روانہ کئے تھے۔اس کے علاوہ ٹونک میں غالبؔ کے احباب بھی تھے۔ان میں طالع یار خاں اور نجف علی خان جھجھری اہم تھے۔جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے تعلقات بھی ٹونک ریاست سے تھے۔

طالع یار خاں کے ٹونک سے تعلق کے بارے میں سید جمیل الدین بغدادی اپنی کتاب راجستھان کے منتخب تحقیقی وتنقیدی مضامین ۱۹۱۱ء تا ۱۹۵۴ء میں لکھا ہے کہ

''غالب نے مہر نیم روز کا ایک نسخہ جزبی حل لغات تصحیح اغلاط اور تزئین وآرائش کے بعد نواب وزیرالدولہ والی ٹونک کی خدمت میں بھیجا۔تو ان ہی طالع یار کے توسط سے بھیجا اس نسخہ کے سرورق سے پہلے سادہ ورق پر یہ عبارت درج ہے۔''ایں کتاب تاریخ مہر نیم روز بتاریخ ہست ہفتم ۲۷/ جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ معرفت طالع یار خاں صاحب فرستادہ اسداللہ خاں غالب درکتب خانہ حضور

بطور نذر داخل شد۔'' ۱۵؎

غالبؔ کے ہم عصروں میں سید نجف علی خاں جھجھری کا نام بھی اہم ہے۔ انھوں نے الور قیام کے دوران غالب کی فرمائش پر'' دسفرنگ دساتیر'' لکھی یہ قدیم ایرانی زبان دری اور دساتیری ادب کی فرہنگ ہے۔ ۱۶؎

ٹونک میں رہتے ہوئے سید نجف علی خان جھجھری نے ایک کتاب'' دری کشا'' کے عنوان سے تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں غالبؔ کی تقریظ بھی شامل ہے۔ نواب محمد علی خان کے دور میں ریاست علم و ادب کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری ان کے ہی دور میں سرکاری زبان کا درجہ فارسی کی جگہ اردو کو دیا گیا تھا۔ ان کے ہی دور میں منشی کالکا پرساد مجیب نے ۱۸۶۷ء میں ٹونک میں ایک پریس کی بنیاد ڈالی تھی اور کئی گزٹ بھی شائع ہوئے اسی کے ساتھ وہاں سے اخبارات کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ جن میں سے قابل ذکر اخبار ورسائل مندرجہ ذیل ہیں۔

اس ریاست کا پہلا اردو اخبار'' امین الاخبار'' ۱۸۸۴ء میں جاری ہوا۔ پھر اس کے بعد' حدیقۃ الاخبار' ۱۸۸۵ء میں منظر عام پر آیا تو اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں سفیر ٹونک نامی اخبار جاری ہوا۔ اس کے علاوہ ۱۹۳۹ء میں گزٹ ریاست ٹونک شائع ہوا۔ اس گزٹ میں سرکاری خبریں شائع کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہفتہ جنگ عہد جدید، ۱۹۴۷ء ساحل ۱۹۵۰ء کے علاوہ سلام، مشعل، جھلک، پندررہ روزہ اخبار بھی جاری ہوئے۔

نواب ابراہیم علی خاں کے عہد میں فن کاروں کو سرپرستی حاصل ہوئی تو ملک کے مختلف علاقوں سے ادیب اور شاعران کے دربار سے وابستہ ہوئے اور فن کاوں نے دربار کو جلا بخشی۔ ابراہیم خاں کے عہد ہی میں اسدؔ لکھنوی، ظہیرؔ دہلوی، بسملؔ خیر آبادی، مضطرؔ خیر آبادی، دیوی پرشاد بشاشؔ، ثاقبؔ دہلوی، آنورؔ دہلوی وغیرہ کی شرکت سے ٹونک کو زینت ملی۔ اس کے علاوہ نواب ابراہیم علی خاں خود بھی شعر وسخن سے دلچسپی رکھتے تھے اور خلیل تخلص اختیار کرتے تھے۔ ان کے کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے

ضرب المثل اور محاورات کو اشعار میں باندھ کر نئی روایت بھی قائم کی۔ان کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں

تلاش اس کی غنچے ایسے کیا وہ بگڑے　　مگر کیا چور کی داڑھی میں تنکا

دہن سے اس کے غنچے تجھ کو نصیب　　یہ کیا گفتار چھوٹا منھ بڑی بات

اے صاحب آئی جس کو میری یاد　　ہاں تو کیا اس نے کہا یاد ش بخیر ۱۷

نواب سعادت علی خان کا دور بھی ادبی لحاظ سے باوقار اور قابل قدر رہے وہ بھی شاعر تھے۔اور سید مختا رتخلص رکھتے تھے۔ان کے دربار میں جام ٹونکی، شفق ٹونکی، کیف ٹونکی، صیف ٹونکی، بھائی جان عاشق اور اختر شیرانی جیسے شعراء وابستہ تھے۔

ٹونک میں گرچہ حکمرانی ختم ہوگئی لیکن وہاں پر ادبی فضا قائم رہی۔ٹونک کے آخری نواب اسماعیل علی خان شعر وسخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔جس کی وجہ سے آزادی کے بعد بھی وہاں پر ادبی محفلوں اور مشاعروں کا انعقاد ہوتا رہا ہے۔جن میں جوشؔ ملیح آبادی، ساغرؔ نظامی، روشنؔ صدیقی، غلامؔ ربانی تاباں، حفیظ جالندھری، شعریؔ بھوپالی وغیرہ نے ٹونک میں شاعری کی روایت کو قایم رکھا۔

واضح رہے کہ ٹونک کی سرزمین کو نوابان ریاست کی علم دوستی اور ادب پروری نیز دینی شعار کی وجہ سے ہی وہاں پر علم وادب کے چراغ روشن ہوئے تو وہ چراغ تا حال اپنی ضیاء سے عوام الناس کے ذہن و دماغ کو روشن کیے ہوئے ہیں اور افق ادب پر اپنی موجودگی کا احساس کراتے ہیں۔جو کہ وقت اور حالات کے نیز نئے نئے موضوعات اور حالات حاضرہ کے ساتھ تازہ واردان ادب کو اپنے اسلاف کی ادبی امانت کے پاسدار اور امین بناتے ہیں جو کہ ٹونک کی ادبی زرخیزی کی علامت ہے۔

اس سلسلے میں اگر عہد یا پھر مابعد ریاست دیکھا جائے تو حافظ محمود شیرانی جیسا محقق، ان کے فرزند اخترؔ شیرانی جیسا رومانوی شاعر اپنی قلمی جولانیوں سے اپنا لوہا منواتے ہیں تو دوسری جانب بسملؔ سعیدی مرحوم اور ان کے شاگرد رشید مخمورؔ سعیدی مرحوم اپنے فکر وفن سے عالمی ادب میں اپنا مقام متعین کر کے سرزمین ٹونک کا نام روشن کرتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ ان ہی ادبی محافل اور ادبی تنظیموں کے اثرات ہیں۔جن کی تخم ریزیِ اہل ادب نے نواردان ادب کے لئے کی تھی ان ہی نواردان میں راجستھان کے اولین محقق ڈاکٹر ابو الفیض عثمانی ہیں جنھوں اپنے تحقیقی کام سے اس ادب کو (راجستھان میں جو کہ علمی اعتبار سے پچھڑا ہوا تھا لیکن ادبی اثر ہنوز باقی تھے) منصۂ شہود پر لائے اور پھر ان کے ہی نقش قدم پر چلتے ہوئے آئندہ آنے والی نسل نے اپنے لیے تحقیق کی راہیں کھولی ہیں اور زندگی کے لئے راہ متعین کی ہے۔

ان کے علاوہ بہارؔ ٹونکی، جامؔ ٹونکی، بصرؔ ٹونکی، جیسے مایہ ناز ادبی حضرات کی خدمات بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔جب کہ ایک ناقد، ناثر، ناظم اور اطفالی ادب میں راجستھان کے تعلق سے اولیت اور فوقیت رکھنے والے مختارؔ ٹونکی جیسی شخصیت بھی اسی سرزمیں سے وابستہ ہے۔

قانون فطرت ہے کہ ہر کمال را زوال است اور یہی قانون ٹونک کی ادبی دنیا پر بھی صادق آیا وقت بدلا حالات بدلے اور رفتہ رفتہ ادب کی وہ رنگینیاں ختم سی ہوگئیں اور وقت کے ساتھ تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں اور آزادی کے بعد کے احوال کا ذکر کرتے ہوئے شمیم ٹونکی اپنے تذکرہ شعرائے ٹونک میں یوں رقم طراز ہیں کہ

> ’’آزادی کے بعد ٹونک میں بھی نئے احساسات اور نئے تصورات کی شمعیں شعروادب جگمگانے لگیں۔ترقی پسند ادب، رومانوی ادب اور جدید ادب کے باعث یہاں پر تبدیلیاں واقع ہوئیں۔‘‘[1]

☆ ☆ ☆

﴿حوالہ جات باب اول﴾

۱۔ رہنمائے ضلع ٹونک دھرمیندر بھٹناگر، بی کے سنگھل ص۲۴

۲۔ تاریخ ریاست ٹونک ہنومان سنگھل ص۱۲

۳۔ تاریخ ریاست ٹونک ہنومان سنگھل ص۱۳

۴۔ ریاست ٹونک اور اردو شاعری مختار شمیم ص۱۶

۵۔ ریاست ٹونک اور اردو شاعری مختار شمیم ص۲۰

۶۔ ریاست ٹونک کے حکمراں ذی شان صاحبزادہ عبدالمعید خان ص۲۵

۷۔ ریاست ٹونک کے حکمرانوں کا تعارف صاحبزادہ عبدالمعید خان ص۱۲

۸۔ تاریخ ریاست ٹونک ہنومان سنگھل ص۱۹۴

۹۔ تاریخ ریاست ٹونک محمد اعجاز خان ص۱۹۰

۱۰۔ تہذیب الاخلاق ماہنامہ اکتوبر ۲۰۱۱ء ص۷

۱۱۔ ریاست ٹونک کے حکمراں ذی شان صاحبزادہ عبدالمعید خان ص۴۰۔۴۱

۱۲۔ ریاست ٹونک کے حکمراں ذی شان صاحبزادہ عبدالمعید خان ص۸۴

۱۳۔ تذکرہ شعرائے ٹونک صاحبزادہ امداد علی خان، شمیم ٹونکی ص۸

۱۴۔ راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ قمر جہاں بیگم ص ۷۰

۱۵۔ غالب اور راجستھان شاہد جمالی ص۲۶۸

۱۶۔ غالب اور راجستھان شاہد جمالی ص۲۷۵

۱۷۔ ریاست ٹونک اور اردو شاعری مختار شمیم ص۱۵۲

۱۸۔ ریاست ٹونک اور اردو شاعری مختار شمیم ص ۱۰

☆☆☆

باب دوم

مختار ٹونکی کے سوانحی کوائف

باب دوم

مختارؔ ٹونکی کے سوانحی کوائف

صوبہ راجستھان کا ویسے تو ذرہ ذرہ تاریخ کے اوراق سے بھرا پڑا ہے لیکن راجپوتانے کے اس علاقے میں اکلوتی مسلم ریاست ٹونک بھی تھی جو جے پور سے تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر کی دوری پر واقع تھی۔ اس ریاست کی تاریخی، تہذیبی، تمدنی خدمات نمایاں رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ ریاست علمی وادبی اعتبار سے بھی مرکزیت کا درجہ رکھتی ہے۔ ریاست ٹونک میں بانیٔ ریاست نواب امیر خان کے عہد حکمرانی سے لے کر دور حاضر تک اردو زبان وادب کے فروغ کا سلسلہ جاری ہے اور سرزمین ٹونک کو یہ وقار حاصل رہا ہے کہ وہ دائم ومدام علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ اسی سرزمین سے ایسے نامور ادیب، باکمال شاعر، صاحب علم وفن، عالم و فاضل، علماء ودانشور، پیدا ہوئے۔ جنھوں نے عالم ادب میں اپنا ایک مقام حاصل کیا ہے۔ جو اپنی ذہنی وفکری صلاحیتوں اور اپنے ادبی کارناموں کی سبب دنیائے ادب میں زندہ وجاوید ہو گئے ہیں۔ جن کی لیاقت اور صلاحیت کو ایک عالم نے تسلیم کیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس سلسلے میں عہد حاضر کے قلم کار جن کی ادبی حیثیت اور علمی خدمات اہل ٹونک کے لئے باعث فخر ہیں۔ ان میں مختارؔ ٹونکی کا نام ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

سید مختار علی مختارؔ ٹونکی راجستھان کے موجودہ نامور ادیبوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی پیدائش ٹونک کے ایک محلے کالی پلٹن میں ۴/اپریل ۱۹۳۹ء کو سید ممتاز علی کے گھر میں ہوئی تھی یہ ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت ہیں جس نے نثر ونظم نگاری میں مقام حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مزاح نگار کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔

ڈاکٹر فراز حامدی ان کی اس ہمہ جہت شخصیت کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

''اپنی طویل ادبی زندگی میں بہت سے ادباء اور شعراء میرے قریب آئے۔ مگر مختارؔ ٹونکی اس قربت میں سب سے بازی لے گئے اور کیوں نہ لیتے وہ میرے ہم وطن

وہم محلّہ اور ہم پیشہ وہم خیال ہیں ۔ وہ شاعر ہیں ، ادیب ہیں ، ناقد ہیں محقق ہیں ، افسانہ نگار ہیں ، انشائیہ نگار ہیں اور پچھلے ۴۵ برسوں سے متواتر موٴقر رسائل و جرائد میں چھپ رہے ہیں ۔ طنز ومزاح کے میدان میں تو اپنی دو کتابوں سے انھوں سنگ میل قائم کر دیے ہیں ۔ [۱]

خاندان

مختؔار ٹونکی کے دادا سید امداد علی کے چھ نرینہ اولادیں تھیں ۔ ان کا بھرا پورا گھرانہ تھا ۔ جو کہ ایک ہی گھر میں رہائش پذیر تھا ۔ آپ کے والد پیشے سے ڈرائیور تھے جو کہ ریاست کے آخری نواب اسماعیل علی خان کی والدہ مرجینا بیگم کی کار چلاتے تھے ۔ ان کو اللہ نے مال ودولت سے تو نہیں لیکن اولاد کی دولت سے خوب نوازہ تھا ۔ جن کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہے :۔

پسران	دختران
سید مختار علی عرف اچھے میاں	خدیجہ بانو (مرحومہ)
سید مہتاب علی عرف منجو میاں	مسرت بانو
سید معصوم علی عرف شمیم	فریدہ بانو (مرحومہ)
سید منظور علی عرف نعیم	عزیزہ بانو

مختؔار ٹونکی کو ان کے خاندان والوں میں کئی عرفیت حاصل تھیں ۔ گھر والے ان کو اچھے میاں کہتے تھے تو بھائی بہنوں میں سب سے بڑے ہونے کی وجہ سے وہ ان کو بھائی میاں کہہ کر پکارتے تھے تو دوران ملازمت ٹونکی صاحب یا نواب صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے ۔ ادبی دنیا میں وہ مختؔار ٹونکی کے نام سے جانے جاتے ہیں ۔ اپنے نام وگرام کے بارے میں فراز حامدی کو دئے ہوئے انٹر یو میں وہ کہتے ہیں کہ

''میاں ! شیکسپئر نے کہا ہے کہ نام میں کیا دھرا ہے ویسے بھی ہم مختؔار ٹونکی کے قلمی نام سے پڑھے لکھوں میں اچھی طرح بدنام ہیں ، نام وگرام اسی سے پونم

کے چاند کی طرح روشن ہے۔ پھر بھی آپ چاہتے ہیں کہ نام کی رام لیلا سنائیں تو اطلاعاً عرض ہے کہ گھر والوں نے سید مختار کی چھاپ لگائی تھی اور اسکول میں اس کی رپٹ لکھوائی تھی۔ شاید بچپن میں ہم میں کچھ اچھائیاں رہی ہو کیوں کہ اچھے میاں کی عرفیت بھی ہمارے ساتھ لگی ہوئی تھی مگر اب تو ہم خاندان والوں کی نظر میں بڑے ہو کر بڑے میاں ثابت ہو چکے ہیں۔ اب کوئی اچھے میاں نہیں پکارتا۔ چچا، چچیاں، دادا، دادی سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے اور شروع میں ہم سب کے چہیتے تھے اس لئے بھیا بن کر بھی گھر محلے میں مشہور ہوئے۔ پھر دوسرے بھائی بہن باری باری تشریف لائے۔ انھوں نے بھائی میاں بھائی میاں کی رٹ لگا دی جواب تک چل رہی ہے درس و تدریس کے میدان میں گھسے تو اسکولوں میں ہمیں کہیں 'ماس صاحب' کہیں 'نواب صاحب' کہیں 'ٹونکی صاحب' کہہ کہہ کر پکارا گیا کیونکہ ماسٹری کی ملازمت میں گھسنے سے پہلے ہی ہم مختار ٹونکی بن چکے تھے سونے پر سہاگہ اور نام کی دم میں دھاگہ ٹونک کی ایک قصائن تو ہمیں منشی جی کہہ کر پکارتی تھی۔ [۲]

مختار ٹونکی اپنے تخلص کے ساتھ ٹونکی لگاتے ہیں۔ جس کا صریح مطلب یہ ہے کہ وہ اور ٹونک لازم ملزوم ہیں وہ اپنے نام کے ساتھ ٹونکی لگانا فخر و شرف سمجھتے ہیں آگے بیان کرتے ہیں کہ

''یہ تو ہوئی نام کی بات گرام کی سنیئے ہم اس دیش کی باسی ہیں جس دیش میں بناس بہتی ہے اب تو بیسل پور باندھ نے اس ندی کی جھانپ باندھ دی۔ آپ کی طرح ٹونک میں شکم مادر میں اترا اور محلّہ کالی پلٹن میں باہر نکلا۔ محمود شیرانی اور اختر شیرانی نے نہ لگایا ہو بسمل سعیدی نے بھی اپنے نام کا جزو نہ بنایا ہو۔ مگر ہم ٹونکی کا دم چھلا لگانا فخر سمجھتے ہیں۔ کوئی ٹھونک بجا کر دیکھ لے ہم ٹونکی ہیں۔ ٹونک جو کبھی ریاست تھی اب ایک ضلع بن کر رہ گیا ہے'' [۳]

تعلیم

مختار صاحب کی اوائل عمری کا زمانہ آزادی کے حصول اور تقسیم وطن کی وجہ سے افراتفری کا زمانہ تھا۔ گھر کے حالات نا مساعد تھے ادبی ماحول تو تھا لیکن تعلیم وتعلم کا فقدان تھا۔ حالانکہ ان کے خاندان کا شمار آل سادات میں ہوتا تھا گھر میں دین داری تو تھی لیکن عصری تعلیم نہ کے برابر تھی۔ مختارؔ ٹونکی نے ٹونک کی ادبی فضا میں آنکھیں کھولیں اور اسی ادبی ماحول میں ان کی تربیت بھی ہوئی جس سے متأثر ہونا لازمی تھا۔ اور ان کے اندر ذاتی طور پر علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس شوق کی تکمیل کی غرض سے موصوف محلّہ امیر گنج میں واقع مدرسہ فرقانیہ میں داخل ہوئے۔

مدرسہ فرقانیہ ٹونک کے قدیم مدارس میں سے ہے جہاں پر آج بھی تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اس مدرسے کو مولانا حیدر حسن خان نے ۱۹۲۰ء میں قائم کیا تھا۔ جس کا مقصد قرآن کی تعلیم مع تجوید دینا تھا۔ انھوں نے اس مدرسہ میں حافظ معظم شاہ سے ناظرہ قرآن پڑھا دینی تعلیم کے ساتھ اس عہد کی مروجہ تعلیم کی تکمیل کے ساتھ عربی فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ فارسی میں انھوں نے رہبر فارسی سے شروع کر کے سعدی شیرازی کی مشہور کتابیں ' گلستان اور بوستان پڑھیں تو عربی زبان میں کتاب الصرف اور کتاب النحو پڑھیں۔ ٹونک میں اس وقت کئی مدارس قائم تھے۔ جن میں دارالعلوا میریہ، دارالعلوم ناصر، مدرسہ فرقانیہ اور دارالعلوم خلیلہ نظامیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن میں دارالعلوم خلیلہ ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ جو کہ نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جس کے بانی علامۃ الہند حکیم سید برکات احمد صاحب تھے۔ اس مدرسہ کی بنیاد ۱۸۹۹ء میں رکھی گئی تھی۔ اور نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے تخلص کی وجہ سے اس کا نام دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ رکھا گیا۔ اس مدرسہ کا شمار اہم دینی وعلمی مراکز میں ہوتا تھا جو کہ اپنی خدمات کی بنا پر نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی اپنی پہچان رکھتا تھا۔ جہاں سے فارغین میں غیر ملکی طلباء بھی تھے۔

موصوف نے مدرسہ فرقانیہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد دارالعلوم خلیلہ نظامیہ میں ۱۹۵۴ء میں داخلہ لیا۔ جہاں پر انھوں نے ادیب، ادیب ماہر کے ساتھ راشٹر بھاشا پر چار سمیتی وردھا کے ہندی امتحانات بھی

پاس کیے۔ وہ اپنی تعلیمی رغبت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم طفل مکتبی بن گئے اور پڑھنے لکھنے کی دھن میں آ گئے پڑھتے گئے نہ جانے کیوں ہمارے ذہن میں کھلبلی مچی رہتی تھی اور دل امنگوں سے بلیوں اچھلتا رہتا تھا کہ ہم جلدی جلدی سب کچھ کر جائیں اور اپنے ہم جولیوں اور ہم سبقوں میں سبقت لے جائیں'' ۴؎

قلم گو ید کہ من شاہ جہانم قلم کش را بدولت میرسانم

اگر بد بخت باشد من چہ دانم ولے یک بار دولت میرسانم

پھر انھوں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ وہ اشہب قلم پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگائیں گے اور ایک دن ادبیات کی خندق کا پار کریں گے۔ ۵؎

دینی و روایتی تعلیم کے تقاضوں کی تکمیل کے بعد عصری تعلیم کے حصول کے لئے وہ ۱۹۵۸ء میں نویں درجہ میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۹ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انھوں نے کالج میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ۱۹۶۳ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ دوران تعلیم ہی انھوں نے مختلف رسائل وجرائد کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ گھر میں اخبار ورسائل نہ ہونے پر وہ میونسپل کی لائبریری میں ان کا مطالعہ کرتے نیز کرائے پر کتابیں لا کر ان کا مطالعہ کرتے۔

ملازمت

۱۹۶۳ء میں اپنی گریجویشن کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد معاش کی فکر ستانے لگی۔ کیونکہ ان کے والد صاحب جو کہ پیشے سے ڈرائیور تھے۔ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بے روزگار تھے اور گھر کی ساری ذمہ داری گھر کا بڑا ہونے کی وجہ سے ان کے کندھوں پر آ گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے پہلے تو ٹونک کے کوآپریٹیو بینک میں درخواست دی اور پھر تفریح کے لیے ناگور چلے گئے۔ مکرانہ ریلوے اسٹیشن پر ان کی ملاقات ایک پرانے دوست سے ہوئی جو ان کو جبراً اپنے ساتھ نوکری کی درخواست کے لیے ناگور لے گئے۔ (اس زمانے

میں مارواڑ کے علاقے میں اردو اساتذہ کی بڑی کمی اور سخت ضرورت تھی) جہاں انھوں نے اپنے اس دوست کے اصرار کی وجہ سے فوری طور پر انٹرویو کے کال لیٹر نکلوایا اور انٹرویو دیا۔ اس وقت انٹرویو کے لئے آنے والوں میں مختار صاحب ہی بی، اے پاس تھے۔ جس کی وجہ سے ان کا تقرر ہوگیا۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کو ملازمت کے لیے زیادہ جد وجہد نہ کرنی پڑی اور وہ ملازمت میں آ گئے۔ دو دن ناگور میں گزارنے کے بعد جب وہ ٹونک واپس آئے تو ان کے والد صاحب نے ان کو خبر دی کہ ان کا کوآپریٹیو بینک میں بطور لون انسپکٹر انتخاب کرلیا گیا ہے۔ یہ سن کر وہ پس وپیش میں پڑ گئے کہ کون سی ملازمت کو قبول کیا جائے تب انھوں نے اپنی والدہ سے مشورہ کیا تو انھوں نے ان کے مشورے سے معلّمی کا پیشہ اختیار کرلیا اور ان کا مکرانہ گونمنٹ پائلٹ ہائی اسکول میں اردو کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔ جہاں پر انھیں ۹۵۱ روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ مکرانہ میں انھوں نے ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۶ء تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس دوران اردو کے فروغ کے لیے بھی کام کیا۔ اور مشاعرے وسیمینار کے ذریعہ لوگوں میں اردو کے تعلق سے رغبت اور دلچسپی پیدا کی۔ ابھی ان کو یہاں پر کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ ان کو ملازمت کی دشواریوں کا بھی سامنا کرنا پڑا کیونکہ کچھ لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگا دیا۔

مختار ٹونکی جس اسکول میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے وہ مسلم علاقے میں تھا۔ اسکول کے مسلم اساتذہ کا پہلے ہی تبادلہ کر دیا گیا تھا مختار صاحب کے ساتھ ان کے ایک ہندو ساتھی کو بھی الزام لگا کر نکالنے کی کوشش کی گئی۔ جس کی وجہ سے اسکول کئی دنوں تک بند بھی رہا۔ اس معاملے کے جانچ کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی اور معاملے کو رفع دفع کرنے کے لے ان کا تبادلہ پربت سر کر دیا گیا۔

پربت سر میں دو سال گزارنے کے بعد انھوں نے ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۶ء تک کچامن سٹی اور ناگور میں اپنی خدمات انجام دیں۔ اس دوران انھوں نے اپنی آگے کی تعلیم جاری رکھی اور ریجنل کالج آف ایجوکیشن اجمیر سے بی۔ ایڈ کی سند حاصل کی۔

۱۹۷۷ء میں محکمہ تعلیم کی طرف سے پرموشن کے بعد ان کا تبادلہ جیسلمیر کر دیا گیا۔ اپنے وطن اور

اہل خانہ سے ملازمت کی وجہ سے دور رہتے ہوئے ان کو ایک طویل مدت ہوگئی تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے ۱۹۷۸ء اپنا تبادلہ ٹونک ضلع میں کروالیا۔ جہاں پر مختلف مقامات پر اپنی خدمات انجام دیتے ہے ہوئے بالآخر ۱۹۹۷ء میں گورنمنٹ دربار سینیئر سکنڈری اسکول ٹونک سے عمر کے ۳۴ برس سرکاری ملازمت میں گزارنے کے بعد پینشن یاب ہوئے۔

شادی خانہ آبادی

مختار صاحب سرکاری ملازمت میں آنے کے تقریباً دس برس کے بعد رشتۂ ازدواج میں جڑے اور ان کا نکاح ٹونک میں احمد خاں تحصیل دار کی صاحب زادی فاطمہ بیگم سے ۱۹۷۳ء میں ہوگیا۔

ان کی شریک حیات واقعی ان کے لیے حیات نو کا مژدہ لے کر آئیں۔ انھوں نے ان کو خانگی پریشانیوں سے آزاد کردیا۔ اور اپنی گھریلو ذمہ داریوں کا بخوبی نبھایا۔ وہ ایک نیک سیرت خاتون ہیں۔ انھیں کبھی کوئی شکایت نہ رہی ان کی زندگی ۴۶ برس سے اہل وعیال کے ساتھ خوش وخرم بسر ہورہی ہے۔

اولادیں

مختارؔ ٹونکی جہاں علم کی دولت سے مالا مال ہیں وہیں اللہ نے ان کو اولاد کی دولت سے بھی نوازا ہے ان کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

پسران	دختران
سید وقار علی	تبسم فاطمہ
سید نثار علی	ترنم فاطمہ
سید اسرار علی	
سید انوار علی	

مختار صاحب نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے دوران دینی و دنیاوی تعلیم دونوں کا برابر خیال رکھا ہے۔ ایک بڑے لڑکے اور ایک لڑکی کی شادی کا بھی فرض ادا کرچکے ہیں۔ اس طرح ان کی گھریلو زندگی

کامیاب کہی جاسکتی ہے۔

قد وقامت

جسامت کے اعتبار سے مختارؔ ٹونکی درمیانہ قد کے مالک ہیں۔ دبلے پتلے، سیدھے سادے، طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے بھی سادگی پسند ہیں۔ ان کے قد وقامت کے سلسلے میں مسعود اختر خاں کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جوانھوں نے ماہنامہ شگوفے میں لکھا تھا۔

''قد میانہ، نرم وگداز دبلا جسم، کھیتا ہوا گندمی رنگ، کشادہ پیشانی اور اس پر تفکر کے مستقل نشان، ناک ستواں، چاندی ہورہے بال، بدن پر قمیص، علی گڑھ کاٹ کا پائجامہ، محفل ومجلس کے لیے شیروانی، کبھی کبھار پینٹ شرٹ سے بھی پرہیز نہیں مختصراً ادیب کے حلیے سے ہم آہنگ۔''

اردو ادب کی دو اہم شخصیات علامہ اقبال اور کرشن چندر کی انفرادی خوبیاں سے مطابقت کرتے ہوئے وہ آگے کہتے ہیں کہ:

''علامہ اقبال کی طرح نہیں جو قد وقامت اور رعب سے پہلی نظر میں مجسٹریٹ نظر آئیں اور تھے بھی مجسٹریٹ یا کرشن چندر کی طرح نہیں جو کہ ناول نگار کم اور بینک منیجر زیادہ لگتے تھے۔ اسے آپ دونوں عظیم ہستیوں کی انفرادی خوبی کہہ سکتے ہیں''[۶]

عادات واخلاق

مختارؔ ٹونکی نہایت سادہ مزاج، سنجیدہ، شائستہ طبیعت، بلند اخلاق اور زندہ دل شخص ہیں۔ وہ صوم وصلاۃ کے پابند ہونے کے ساتھ ہر کام چاہے دوران ملازمت ہو یا بعد از ملازمت اس کے متعینہ وقت پر ہی کرتے ہیں۔

ان کی وقت کی پابندی کے بارے میں مسعود اختر خان ماہنامہ شگوفے میں یوں رقم طراز ہیں کہ

''طے شدہ وقت پر کام کرنے کی عادت بالکل انگریزوں کی طرح سے لیکن انگریزوں

سے کوئی مماثلت نہیں۔سوائے اس کے کہ دوران ملازمت انگریزی خوب پڑھائی
طے شدہ وقت کے کاموں میں مثلاً مغرب کی اذان سے ٹھیک پون گھنٹہ پہلے اپنا گھر
چھوڑ دیتے ہیں ۔ے

موصوف کو پان نوشی کی عادت ابتداء ہی سے ہے۔محفل ہو یا گھر پان نوشی کی عادت ابھی برقرار ہے۔نیز کتب بینی بھی ہنوز جاری ہے۔ ہر ایک سے خواہ وہ دوست ہو یا رشتے دار سب سے بڑے ہی خلوص اور پیار کے ساتھ ملتے ہیں۔اگر کوئی ضرورت مند آپ کے پاس آتا ہے تو اس کی حتی المقدور مدد بھی کیا کرتے ہیں۔

تخلیقی سفر

مختار صاحب اپنے تخلیقی سفر کے بارے میں خود کہتے ہیں کہ

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

بھلا اس صریح حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ انسانی حیات بے ثبات میں سفر مدام ہے۔کہاں قیام ہے مگر اس کرہ ارضی کے تیرہ خاک دان میں بہ نسبت عام انسان خاکی بنیان کے ایک قلم کار اور تخلیق کار دوہرے سفر کے پل صراط سے گزرتا ہے۔شکم مادر سے جب طفل نوخیز روتا بلکتا باہر آتا ہے۔تبھی سے اس کا وجودی سفر شروع ہو جاتا ہے اور جو گود سے گور تک محدود ہوتا ہے اور، جس کے لیے کہا گیا ہے کہ:

بس اتنی دیر کا قصہ ہے زندگانی کا اذان بوقت ولادت نماز بعد از فنا ۸

مختار ٹونکی کی تخلیقی زندگانی کا قصہ جتنا مختصر اور محدود معلوم ہوتا ہے وہ اتنا ہی طویل بھی ہے۔ وہ بیک وقت ایک نثر نگار، انشائیہ نگار، مضمون نگار اور طنز و مزاح نگار کے ساتھ ہی ایک شاعر، ادیب، محقق، تاریخ گو، ناقد دانشور اور بہت کچھ ہیں۔ ان کی اسی رنگا رنگ شخصیت نے ان کو عہد حاضر میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ان کا یہ تخلیقی سفر کئی سالوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جو زمانے کے اعتبار اور ہر زاوئے سے کامیاب ہے۔ان کو مضمون نویسی کا فن قدرت کی طرف سے خاص طور پر ودیعت ہوا ہے۔ وہ اپنے تخلیقی سفر کے آغاز کے بارے میں کہتے ہیں کہ :

''ہم شکم مادری ہی سے قلم اور دوات لے کے پیدا ہوئے تھے کیوں کہ جب ہم نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو تختیاں لکھتے ہوئے پایا۔ مدرسہ میں ہم نے قرآن شریف، عربی، فارسی چاہے شوق سے نہ پڑھی ہو مگر قصے کہانیوں کی کتابیں خوب گھونٹ گھونٹ کر پڑھی ہیں وہ طلسم ہوش ربا، ہو یا قصہ چہار درویش اور طوطا مینا کی کہانی ہو یا فسانہ عجائب سب کو اچھی طرح سے چکھا اور چاٹا۔ سبھی قسم کے اچھے برے ناول پڑھ کو راتیں کالی کیں اور دن سفید کئے ہماری قوت متخیلہ بڑھ گئی اور دماغ میں قلم کار بننے کے جراثیم رینگنے لگے۔ پھر ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لکھنے لگے بے بھاؤ''[۹]

موصوف نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز زمانۂ طالب علمی سے۔ کیا جب وہ دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ میں زیر تعلیم تھے تو ان کے رشحات قلم اسکول اور کالج کی میگزین میں شامل ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شمع کے ادارے سے ہفتہ وار ''آئینہ'' شائع ہوتا تھا۔ جس میں بچوں کے صفحہ پر ان کی اولین تخلیق ''بدحواسی'' کے عنوان سے ۲۳ر جنوری ۱۹۵۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ پھر ان کا پہلا افسانہ ''ملکہ دولت'' اپریل ۱۹۵۷ء کے ہفتہ وار ''پیام مشرق'' میں شائع ہوا تھا۔ تب سے ہی ان کے لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ بچوں کے رسالے ''غنچہ'' ''پھلواری'' ''کھلونا'' ''ٹافی'' ''کھلتی کلیاں'' کے ساتھ اردو کامکس وغیرہ میں ان کی نگارشات شائع ہونے لگیں۔

موصوف نے جس شہر میں آنکھیں کھولیں۔ اس کو علم وادب کا گہوارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے خاندان میں بھلے ہی تعلیم وتعلم کا فقدان رہا ہو لیکن ٹونک کے ادبی ماحول نے ان کو جلا بخشی، جہاں پر ہر طرف شعر وسخن کا چرچہ تھا اور آئے دن مشاعروں کے محفلیں جمتی تھیں۔ ہر جانب شعری و ادبی ماحول تھا۔ ریاست ٹونک کے اس ادبی پس منظر کے سلسلے میں موصوف کی رائے ہے کہ

''واللہ خاندانی ماحول تو یقیناً ہمیں کچھ نہ دے سکا۔ لیکن مرحوم ومعدوم ریاست

ٹونک کے ادبی ماحول نے ہماری سن فکر کو مہمیز کیا اور تخلیقی صلاحیتوں کو صیقل کر جلا بخشی ۔ راجستھان کے بائیس رجواڑوں میں ٹونک واحد مسلم ریاست تھی جس پر ملوکیت سے زیادہ مذہبیت اور شعریت کا غلبہ تھا۔علم وفضل کا گہوارہ شعروسخن کا مرکز اور ادب وحکومت کا دانش کدہ بنی ہوئی تھی ۔اس سرزمین پر عشق ادب اور مذہب کی نکتہ سنجیاں لازمۂ زندگی تھیں ،آئے دن شعری مجلسیں منعقد ہوتی تھیں ، چار بیتوں کا دھوم دھڑ کا رہتا تھا، میلادخوانی کی محافل برپا رہتی اور شبینوں سے فضائیں گونجتی رہتی تھیں'' ۱۰؎

ایسا ماحول تھا اور مختار ٹونکی اپنے آپ کو اس ماحول سے کس طرح سے الگ رکھ سکتے تھے ۔ وہ بھی ان محفلوں میں شرکت کرنے لگے اور وہ ان شعری محفلوں میں ایک خاموش سامع کی حیثیت سے شرکت کرنے لگے جن میں خاص طور پر جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، ماہر القادری، ساغر نظامی، غلام ربانی تاباں جیسی نامور ہستیاں شرکت کیا کرتی تھیں ۔ٹونک کی شعری تقریبات اور انجمنوں میں شرکت کرنے سے ان کے دل میں شعریت کا غلبہ تو ہوا لیکن اس میں وہ آگے نہ بڑھے کیونکہ اس وقت تک ان کے ذہن میں اس قسم کا کوئی ارادہ نہ تھا بلکہ زمانہ طالب علمی سے ہی انھوں نے پڑھا کو بننے کا ارادہ کر لیا تھا۔ بقول خود کہ

''ہم نے کہیں چین کی ایک کہاوت کا مفہوم پڑھا تھا کہ اگر آدمی تین دن مطالعہ نہ کرے تو تمیز کھو دیتا ہے۔''

موصوف کے گھر میں نصابی کتابوں کے علاوہ کوئی بھی کتاب یا رسالہ اور اخبار نہیں تھا جن کا وہ مطالعہ کرتے اور اپنی ادب کی تشنگی کو بجھاتے ۔ اس لئے مختار ٹونکی اسکول سے چھٹی ہوتے ہی سیدھے میونسپل لائبریری میں جا کر اخبار ورسائل کا مطالعہ بڑے ہی شوق سے کیا کرتے تھے۔اس زمانے میں ٹونک میں ایک دوکان ہوا کرتی تھی جہاں پر مختلف شعراء اور ادبا کے کی کتابیں دستیاب تھیں جس کی خاصیت یہ تھی کہ وہاں سے ایک آنہ روز کے کرائے پر کتاب پڑھنے کے لیے ملا کرتی تھی ۔

موصوف نے بھی اپنی جیب خرچ سے کتابیں کرائے پر لے کر پڑھنا شروع کر دیا اور یہ ان کا روزانہ کا معمول بن گیا تھا اس طرح سے ان کو مختلف اصناف ادب کو پڑھنے کا موقع مل گیا۔ اس کتب خانے میں منشی ندیم صہبائی، منشی تیرتھ رام فیروز پوری، صادق سردھنوی، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، عبدالحلیم شرر، نسیم حجازی کے ناول اور تصانیف موجود تھیں۔ مختار ٹونکی پڑھا کو بننے کی کوشش میں کتابی کیڑا بن گئے اور ان کے فکر و خیال میں روانی آ گئی۔

مختار ٹونکی کو اردو ادب سے بے حد لگاؤ ہے اس لگاؤ کی ثبوت یہ ہے کہ وہ زمانۂ طالب علمی ہی سے ادب کی دنیا میں دستک دے چکے تھے اور ان کے تخلیقی ادب کا سفر بھی شروع ہو چکا تھا لہٰذا ان کی تخلیقات اسکول اور کالج کی میگزینوں میں جگہ پانے لگی تھیں لیکن اس وقت تک ان کے ذہن میں ادبی پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے قلم تو اٹھا لیا تھا لیکن ان کو ابھی تک تخلیقی مراحل طے کرنے میں پریشانی کا سامنا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے لکھنے کا سلسلہ بدستور جاری رہا ساتھ ہی گرد و پیش کے ماحول نے ان کو شاعر بھی بنا دیا اور وہ اس راہ پر بھی چل پڑے اور دیگر اصناف سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی لیکن اس وقت تک نثری خیالات میں ربط اور تسلسل نہ تھا جس کی وجہ سے ایک خلش دل میں رہتی تھی۔ اور ان کا منتشر مزاج اسی خیال میں رہتا تھا کہ غالبؔ کی فکر آفرینی، مومنؔ کی نازک خیالی، فراقؔ و فیضؔ کی سخن آرائی کے ساتھ اخترؔ شیرانی کی طرح حسین اور خوبصورت شاعری کر پائیں گے۔ اسی کشمکش کے عالم میں انھوں نے شاعری کا خیال اپنے دل سے نکال دیا لیکن ان کا لکھنا بدستور جاری رہا۔

مختار ٹونکی کا اصلی تخلیقی سفر اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب ۱۹۶۳ء میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں سنگ مرمر کے شہر مکرانہ میں بطور مدرس ان کا تقرر ہوا۔ مارواڑ کے اس علاقے میں ادبی ماحول بالکل نہ تھا۔ جس کی وجہ سے یہاں پر کوئی رجحان نہ تھا اور اردو کے اساتذہ کی کمی ہمیشہ رہتی تھی۔ یہاں کا غیر ادبی ماحول دیکھ کر موصوف کو بڑی تکلیف ہوئی۔ وہاں پر موصوف ادب کے خادم کے طور پر اکیلے اور تنہا تھے۔ لیکن وہ اس اکیلے پن میں بھی اپنا تخلیقی سفر ترک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مشق سخن کے بجائے نثر

نگاری کی طرف توجہ کی ۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس راہ کی دشواریوں کا پار کرنے کا حوصلہ رکھنے والے ہی اس راہ ہر گامزن ہوتے ہیں ۔ لہٰذا مکرانہ ہی میں رہتے ہوئے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا اور متعدد افسانے اور مضامین لکھے ۔ جو اس وقت کے رسائل ''پیام مشرق'' ایشیاء'' خاتون مشرق'' میں شائع ہوتے تھے ۔ ان سے قبل بھی اردو ادب میں متعدد افسانہ نگار اور کہنہ مشق شاعر موجود تھے لیکن انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کو برابر جاری رکھا ۔ ان کا ارادہ پکا اور منزل بھی طے تھی کہ ان کو ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام حاصل کرنا ہے ۔ لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے ذہن میں انتشار ہی رہا کہ وہ کس راہ کا انتخاب کریں ۔

مختار ٹونکی نے اصناف شاعری کے ساتھ نثر نگاری کے مختلف میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ مضمون افسانے اور انشائیوں کے ساتھ خاص طور پر انھوں نے طنز و مزاح نگاری پر توجہ کی ہے ۔ انھوں نے اردو زبان کے تقریباً سبھی ادیبوں کو پڑھا ہے اور خاص طور پر تو انھوں نے مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کا مطالعہ بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ کیا ہے اور اسی کے اسلوب نگارش کی روشنی میں انھوں نے طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھا ہے ۔

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت بہت قدیم ہے ۔ اس میدان میں احمد شاہ پطرس بخاری ، مشتاق احمد یوسفی ، رشید احمد صدیقی ، فرحت اللہ بیگ جیسے نامور اور باکمال طنز و مزاح نگاروں نے اپنی تحریروں سے قارئین کو ہنسنے اور مسکرانے پر مجبور کر دیا ہے ۔ موصوف نے کلاسیکی ادب کے مطالعہ سے پایا کہ طنز و مزاح میں معیاری و شائستہ ادب کی کمی ہے ۔ اس لیے اس فن میں اپنے قدم جمائے ۔ وہ طنز و مزاح نگاری کے بادشاہ کہے جانے والے مشتاق احمد یوسفی سے بہت متاثر تھے ۔ چنانچہ ان کا ہی انداز بیان اختیار کیا اور خاص بات یہ ہے کہ مشتاق یوسفی اور مختار ٹونکی دونوں کا ہی تعلق ٹونک سے ہے ۔ اسی لیے وہ ان کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

مختار ٹونکی نے طنز و مزاح کے میدان میں اپنا سکہ جما ہی لیا اور کافی کامیابی حاصل کی ۔ اس میدان میں اب تک ان کے چار مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ''اوٹ پٹانگ'' ۱۹۹۴ء میں سب سے پہلا مجموعہ منظر عام پر

آیا تھا۔اس کے بعد ۲۰۰۱ء میں دوسرا مجموعہ ''لغویات'' آیا جب کہ ۲۰۱۵ء میں ''خرافات'' کے نام سے تیسرا مجموعہ آیا۔اسی طرح سے ان کا چوتھا مجموعہ مزخرافات ۲۰۱۷ء میں منظر عام پر آیا جبکہ پانچواں مجموعہ ''ہفوات'' ۲۰۲۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔

ان کے مضامین اور انشائیے مختلف رسائل و جرائد کے علاوہ اخبارات کی زینت بھی بنتے رہے ہیں۔ اخبار ''راشٹریہ سہارا'' میں ان کے پچاس سے زیادہ انشائیے شائع ہو چکے ہیں۔ دراصل وقت، ماحول اور حالات کی وجہ سے موصوف کے ذہن میں جو بھی اختراع ہوتی تو وہ اس کو طنز و مزاح کے پیرائے میں ڈھال کر اپنے احساس کو قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ آج کے اس دور میں قاری کی توجہ مبذول کرانا بڑا ہی مشکل مرحلہ ہے۔اس لیے وہ اپنے موضوع ایسا منتخب کرتے ہیں کہ قاری خود بہ خود اس کے طرف متوجہ ہو جائے۔عنوان کے انتخاب کے بعد وہ اس کے مطابق اس کو مکمل کرنے کے جد و جہد اور کوشش میں لگ جاتے ہیں۔

موصوف بطور نثر نگار جتنے مشہور ہیں میدان شاعری میں بھی وہ اتنے ہی کامیاب ہیں۔شعر گوئی بھی ان کو ٹونک کے ادبی ماحول سے ملی ہے۔اسی ادبی فضا کی وجہ سے ٹونک کے ہر فرد خواہ مرد، عورت بوڑھے، بچے شعریت ہر فرد کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔جس کا اثر ان پر بھی ہونا لازمی تھا اور وہ ہوا بھی اور وہ اس کے نتیجے میں شوقیہ شاعری کرنے لگے شوقیہ طور پر ہی سہی لیکن انھوں نے تمام ہی اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی۔وہ غالبؔ اور مومنؔ کے ساتھ اخترؔ شیرانی کی حسن بیانی سے متاثر ہیں۔ان کی پہلی اشاعت ان کی نظم ''حدیث وطن'' ہے جو کہ ''نیا دور'' کے جنوری ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ انھوں نے قطعات، رباعیات، ماہیئے، ہائیکو، سین ریو میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور وہ بھی ان کے ادبی ذخیرے میں شامل ہیں۔ان کا کلام تقریباً نصف صدی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔اردو زبان کے علاوہ ہندی زبان میں بھی ان کے لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی صاحب اپنی کتاب ''ادبیات راجستھان''

میں لکھتے ہیں کہ

''آپ بہ حیثیت شاعر ممتاز مقام رکھتے ہیں۔اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہیں۔ملک کے مقتدر رسائل ان کا کلام بصد شکر یہ شائع کرتے ہیں۔زبان و بیان پر قدرت رکھنے کی وجہ سے ہر صنف سخن میں کامیابی حاصل کی ہے۔ایک سچے فن کار ہیں، احساس کی شدت پوری طرح رچی بسی ہوتی ہے۔ان کے فن کی خصوصیات میں احساس کی شدت ہر طور زندہ و بیدار ہے اس لیے ان کی انفرادیت روایت و جدت کی مرہون منت نہیں۔ ۱۱

آگے وہ اسی غزل گوئی کی تعریف میں کہتے ہیں کہ

غزل کی کلاسیکی روایت کو وہ عصری میلانات میں اس طرح سے مدغم کرتے ہیں کہ اثر آفرینی دوآتشہ ہو جاتی ہے۔تازہ کاری اور سادگی و پرکاری بھی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔دلی جذبات اور قلبی واردات کا بیان بھی انھوں نے خوب کیا ہے۔ ۱۲

مختار ٹونکی نے جب باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا تو انھوں نے بصر ٹونکی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بصر ٹونکی اپنے زمانے کے ایک بڑے سخن ور اور تاریخ گو شاعر تھے۔ملازمت کے سلسلے میں جب وہ ناگور میں تھے تو وہ ڈاک کے ذریعہ اپنا کلام اصلاح کے لیے بصر صاحب کے پاس بھیجتے تھے اور وہ اس کی اصلاح کر کے واپس ڈاک سے بھیجتے تھے۔ٹونک تبادلہ ہو جانے کے بعد تو انھوں نے باقاعدہ طور پر ان سے مشورۂ سخن کیا۔

موصوف کی یہ ہمہ جہت شخصیت ہی ہے کہ وہ نثر و نظم کے علاوہ ادب اطفال پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر انھوں نے متعدد ناول اور نصیحت آمیز کہانیاں لکھیں ہیں۔جن میں ''عیار عورت''، ''خونی غبارے''، ''ڈاکو نیلم'' اور ''پراسرار فقیر'' جیسے جاسوسی اور دلچسپ ناول لکھے۔اس کے علاوہ بچوں کے لیے بڑی ہی اعلیٰ اور عمدہ نظمیں بھی لکھی ہیں ''یہ دنیا بچوں کی''، ''دیسی لوک کہانیاں''، ''سچی کہانیاں'' کتابیں بھی انھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔

ان کی نگارشات نہ صرف ملک میں بلکہ پاکستان میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ایسا کوئی رسالہ نہیں جس میں ان کی تخلیقات نہ ہوں نیز راجستھان اور ملک کے دیگر صوبہ جات میں وہ مختلف سیمینار، مشاعرے، سمپوزیم، ادبی تقریبات اور تعلیمی ورکشاپ میں بطور شاعر اور مقالہ نگار شرکت کرتے رہتے ہیں۔آکاش وانی جے پور ریڈیو فیچر، ریڈیو تقاریر ان کے کلام کو بصد شکریہ نشر کرتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ کئی ادبی انجمنوں، اداروں اور سوسائٹیوں سے وابستہ رہے ہیں۔

﴿ ٹونک ادبی سوسائٹی ﴾

ملک میں اردو ادب کے فروغ کے لیے کئی انجمنوں، اداروں، اکیڈمیوں اور سوسائٹیوں کا قیام کیا گیا۔سرزمین ٹونک میں بھی عہد ریاست سے ہی مختلف انجمنیں اور ادارے قائم کئے گئے تھے جو کہ ملک کی آزادی کے بعد بھی اس کے فروغ کے برابر کوشاں رہے تو کچھ محبان اردو اور معتبر ادباء نے یہ محسوس کیا کہ اردو کے فروغ کے لیے جو بھی تنظیمیں قائم ہوئی ہیں۔ان کا مقصد صرف شعروشاعری کے لیے ہی نہ ہو بلکہ ان کا دائرہ تحقیق وتنقید اور جدید رجحانات تک وسعت لیے ہوئے ہو۔اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایسی ادبی سوسائٹی قایم کی جائے۔جو تعمیری ادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ٹونک کی ادبی خدمات کو بھی منظر عام پر لائے۔اس مقصد کے حصول کے لیے ٹونک کے سربراہ، شعراء اور افسانہ نگاروں نے ۲۱/نومبر ۱۹۹۱ء کو ٹونک میں ایک ادبی سوسائٹی کا قیام کیا جس کی صدارت کی ذمہ داری سب سے پہلے مختارؔ ٹونکی صاحب کے کندھوں پر آئی بقیہ ذمہ داران کی فہرست درج ذیل ہے۔

سرپرست : محمد صادق بہار ٹونکی

صدر : مختارؔ ٹونکی نائب صدر : ڈاکٹر عمر جہاں

سیکریٹری : ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی جوائنٹ سیکریٹری : مسعود اختر

خازن : عبدالغفار آڈیٹر : عبدالمجید

اس سوسائٹی کی جانب سے ہر پندرہ دن میں ایک ادبی نشست ہوتی تھی۔جس کا انعقاد باری باری ہر

ممبر کے گھر پر کیا جاتا تھا۔ جن میں نثری و شعر دونوں تخلیقات پیش کی جاتی تھیں ۔ اردو ادب کے رجحانات پر بھی بحث و تبصرہ کیا جاتا تھا، ۔ ان پڑھے ہوئے مضامین کو ریکارڈ کے طور پر رکھا جاتا تھا لیکن اس سوسائٹی کا قیام صرف دو سال کی قلیل مدت کے لیے ہی رہا۔ اس مدت میں سوسائٹی نے متعدد اہم ادبی اجلاس منعقد کرائے نیز ''اردو پڑھاؤ'' کے عنوان سے ایک مہم کی بھی شروعات کی تھی ۔

ٹونک کی اس ادبی سوسائٹی میں پڑھے گئے مضامین، افسانے اور دیگر تخلیقات کو یکجا کر کے ان کا مجموعہ ''ادراک ادب'' کے نام سے شائع کیا گیا جو کہ اس سوسائٹی کی ادبی کاوشوں کا ایک بین ثبوت ہے ۔

بقول مختار ٹونکی صاحب

''یہ تمام ادبی مواد تخلیق اور تحقیق کا حسین امتزاج ہے ۔''

اس سوسائٹی میں ایسے قلم کار شامل تھے ۔ جنھوں نے اردو دنیا میں ایک خاص مقام حاصل کیا تھا۔ اور ان کی تخلیقات ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی تھیں ۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے قلم کار بھی تھے ۔ جو اس سوسائٹی کے ذریعہ اپنی شناخت کو قائم کر رہے تھے ۔ اس سوسائٹی کی خصوصیات یہ تھیں کہ نو آموز لکھنے والوں کو موقع دے کر ان کو ادبی شاہراہ پر گامزن کرنا تھا۔ اس سوسائٹی میں منعقد ہونے والے پروگراموں اور نشستوں میں مختار ٹونکی کے پڑھے گئے مضامین کی فہرست مندرجہ ذیل ہے :۔

۱۔	استاد پندے خاں	طنزیہ	یکم/دسمبر ۱۹۹۱ء
۲۔	دو جان ایک قالب	طنزیہ	۱۷/مئی ۱۹۹۲ء
۳۔	ن سے ناک	انشائیہ	۳۱/اگست ۱۹۹۲ء
۴۔	اٹھ ساقی تلوار اٹھا		۱۵/نومبر ۱۹۹۲ء
۵۔	ہدایت نامہ فقیر	مزاحیہ	۲۹/ اگست ۱۹۹۳ء

﴿ کارکردگی کا اجمالی جائزہ ﴾

(الف) رسورس پرسن

۱۔ ٹریننگ اردو اساتذہ ایس،آئی،ای،آر،ٹی اودے پور،راجستھان

۲۔ اسٹیٹ ٹاسک فورس راجستھان لٹریری مشن ، جے پور

۳۔ اردو فاصلاتی تعلیمی کورس بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن،اجمیر

(ب) رکن :۔

۱۔ انجمن اساتذہ اردو راجستھان

۲۔ جن وادی لیکھک سنگھ راجستھان

۳۔ محمود شیرانی اکادمی ٹونک

(ج) صدر:۔

ٹونک ادبی سوسائٹی،ٹونک (راجستھان)

(د) شمولیت:۔

۱۔ ضلع ساکشرتا سمیتی ٹونک کی جانب سے تعلیم بالغان کے لیے اردو میں لکھی گئی کتابوں ''آؤ ہم پڑھیں'' حصہ اول تا سوم کے لیے تیاری کی سمیتی میں شمولیت۔

۲۔ اردو شکشا کرمی ٹریننگ ماڈیول (مدارس کے اساتذہ کے لیے) لوک جنبش پریشد، جے پور

۳۔ صوبائی اور قومی سطح پر منعقد ہونے والے سیمینار،سمپوزیم،ورکشاپ اور مشاعروں میں مقالہ اور شعر خوانی۔

۴۔ آل انڈیا ریڈیو جے پور کے اردو پروگرام ''کہکشاں'' میں فیچرس اور افسانوں کی نشریات

۵۔ ٹی،وی کے پروگرام ''بزم ادب'' میں شمولیت

ادارت :۔

''ماہنامہ شفق''ٹونک (مدت دوسال)

اعزازات وانعامات:۔

۱۔ راجستھان اردو اکادمی اوراتر پردیش اردو اکادمی کے ادبی ایوارڈ برائے کتب۔

۲۔ جیمینی اکادمی پانی پت کی جانب سے بہ سلسلہ مجموعی ادب خدمات سندی ایوارڈ۔

۳۔ ضلع کلکٹر ٹونک کی جانب سے''قومی خواندگی مہم''میں اعلی کارکرگی پر اعزاز۔

۴۔ ''بزم خوش دلان جودھ پور'' کی جانب سے اعزازیہ تقریب میں سپاس نامہ۔

۵۔ 'درگاوتی فیلوشپ''شاہ پورا کی جانب سے سپاس نامہ اور مومنٹو۔

۶۔ ''ساہتیہ کلا منڈل''ٹونک کی زیر اہتمام اعزازیہ تقریب۔

۷۔ ''غالب سوسائٹی''جے پور کی جانب سے''محسن اردو ایوارڈ''۔

۸۔ بہار اردو اکادمی پٹنہ کی جانب سے''شاد عظیم آبادی ایوارڈ''۔

۹۔ راجستھان پتریکا ہندی (یومیہ اخبار) کی جانب سے منعقد مقابلہ گیت نویسی میں اول آنے پر انعام۔

۱۰۔ ''راشٹری سہارا''اردو اخبار کے مقابلہ مضمون نویسی اور افسانہ نگاری میں اول آنے پر انعام۔

۱۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد عربی، فارسی، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کی جانب سے لائف ٹائم ایچیومنٹ ایوارڈ اور

۱۲۔ ٹونک آسکر کی جانب سے دل ایوبی ایوارڈ ۲۰۱۷ء۔

☆ ☆ ☆

﴿حوالہ جات باب دوم﴾

۱ ماہنامہ شگوفے جولائی ۲۰۱۴ء ص۵۱

۲ ماہنامہ شگوفے جولائی ۲۰۱۴ء ص ۵۱

۳ ماہنامہ شگوفے جولائی ۲۰۱۴ء ص ۵۲

۴ ماہنامہ شگوفے رومیں ہے رخش عمر جولائی ۲۰۱۴ء ص۲۳

۵ ایضاً ایضاً ایضاً

۶ مضمون مختار ٹونکی جن کے سر ہے طنز مزاح کی کلاہ افتخار از مسعود اختر ماہ نامہ شگوفے ص۴۵

۷ ماہنامہ شگوفے ص۴۵

۸ مضمون رومیں ہے رخش عمر تخلیقی سفر ماہنامہ شگوفے جولائی ۲۰۱۴ء ص۲۳

۹ ماہنامہ شگوفے مختار ٹونکی انٹریو کے مکڑ جال میں ڈاکٹر فراز حامدی جولائی ۲۰۱۴ء ص۵۲

۱۰ ماہنامہ شگوفے مضمون رومیں ہے رخش عمر تخلیقی سفر بقلم خود جولائی ۲۰۱۴ ص۲۳

۱۱ راجستھان کے طنز و مزاح نگار شاعر مختار ٹونکی ادبیات راجستھان عزیز اللہ شیرانی ص۲۲۴

۱۲ ایضا ایضا ایضا

☆☆☆

باب سوم

مختار ٹونکی اور ان کے ادبی کارنامے

باب سوم

مختار ٹونکی اور ان کے ادبی کارنامے

اردو شاعری کی طرح اردو نثر کا با قاعدہ آغاز بھی دکن کی سرزمین سے ہوا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں علاؤالدین خلجی کے دکن میں قیام اور اس کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں محمد تغلق کے اپنے دار السلطنت کو دیوگری سے دولت آباد منتقل کرنے کے بعد اردو زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ ان حکمرانوں کی فوجوں کے ساتھ آئے ہوئے صوفیاء، فقراء، تجار، اور درویشوں کی وجہ سے اردو زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ نیز اس دور کے سرکاری دفاتر میں اردو زبان کے استعمال کا پتا بھی ہم کو تاریخ فرشتہ سے ملتا ہے۔

اردو زبان کو مقبول بنانے میں صوفیائے کرام کا اہم رول رہا ہے۔ جن میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز خاص مرتبہ رکھتے ہیں اور ان کی تصنیف ''معراج العاشقین'' کو اس ضمن میں اولیت اور فوقیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ میراں جی شمس العشاق کی ''مرغوب القلوب'' جس میں تبلیغی افکار کا بیان ہے۔ برہان الدین جانم کی ''کلمۃ الحقائق'' ہشت مسائل'' اور ''ذکر تجلی'' اور خلیفہ امین اعلیٰ کی ''گنج مخفی'' کو اہم نثری تصانیف میں شمار کیا جاتا ہے۔

سترہویں صدی اردو نثر کی ترقی اور اس کے اس فروغ کے سلسلے میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دور میں ملا وجہی نے ''سب رس'' ۱۶۳۵ء میں تصنیف کر کے اردو ادب کو نثری شاہ کار پیش کیا۔ سب رس کے بعد دکن میں مذہب اور تصوف کے موضوعات پر متعدد تصانیف لکھی گئیں۔ جن میں 'پنچ تنتر' اور 'ہتو پدیش کی کہانیوں' کو 'طوطی نامہ' کی عنوان سے لکھا گیا۔ ان تصانیف کے بابت عظیم الحق جنیدی کہتے ہیں کہ:

> ''اردو نثر نے بھی دکن کے آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اگر چہ اس زمانے میں سب ہی کتابیں مذہبی موضوعات پر لکھی گئیں اور ان کو کوئی خاص ادبی حیثیت بھی حاصل نہیں پھر بھی ان تصانیف سے اردو نثر کے ارتقاء کا انداز ہوتا ہے۔''[1]

دکن کے بعد جب ہم شمالی ہند میں نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو اورنگ زیب کے دور میں جعفر زٹلی کی تحریروں میں اردو نثر کے نمونے ملتے ہیں۔شمالی ہند کی با ضابطہ پہلی نثری تصنیف فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' کو تسلیم کیا جاتا ہے۔جس میں عربی، فارسی، دکنی کے ساتھ اردو کے الفاظ اور محاورے بھی شامل ہیں۔اس کے علاوہ اگر قدیم اردو نثر میں ہم دیکھتے ہیں تو ہم کو شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بیٹے شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے قرآن کے تراجم اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں عطا حسین خاں تحسین کی ''نوطرز مرصع'' جو کہ فارسی قصہ چہار درویش کا ترجمہ تھی سے اردو میں داستانی ادب کی ابتداء ہوتی ہے۔لیکن اس کا اسلوب مقفیٰ و مسجع اور عبارت پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے بھاری اور غیر مانوس الفاظ کی وجہ سے عوام الناس کے لیے مشکل تھی۔

۱۸۰۰ء میں جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام ہوا تو اردو نثر میں سادہ سلیس اور عام فہم زبان کا فروغ ہوا۔اس کالج کے ادیبوں میں میرؔ امن، میرؔ کاظم علی جواں، بہادر علی حسینیؔ، مرزا علی لطفؔ وغیرہ نے اردو نثر کے فروغ کے لیے اہم رول ادا کیا اور سلیس اور عام فہم نثر کو فروغ دیا۔ان میں سرفہرست میرؔ امن ہیں جن کی کتاب ''باغ و بہار'' ہے۔جو اسی ''قصہ چہار درویش'' کا آسان اور عام فہم اردو میں ترجمہ ہے۔جس کو اس سے قبل میر عطا حسین خان تحسین ترجمہ کر چکے تھے۔

ملک گیر سطح پر نثری خدمات کے علاوہ اگر صوبائی تناظر میں دیکھا جائے تو راجستھان میں بھی اسی دور میں نثر کے اولین نقوش ''قصۂ رنگین گفتار'' کی شکل میں ملتے ہیں۔اس تعلق سے ڈاکٹر قمر جہاں بیگم اپنی کتاب راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی یوں رقم طراز ہیں کہ:

> ''یہی وہ دور ہے جب کہ راجستھان میں اردو نثر کا نقش اول ''قصہ رنگین گفتار'' کی شکل میں نظر آتا ہے۔گویا ہم کہہ سکتے ہیں جب شمالی ہند میں اردو نثر داستانی ادب کی صورت میں ترقی کر رہی تھی تو اسی زمانے میں راجستھان میں داستانی ادب کا سنگ بنیاد ''قصۂ رنگین گفتار'' کی شکل میں رکھا جا رہا تھا قصہ رنگین گفتار،

عظمت اللہ نیاز دہلوی نے ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۱۱ء میں تصنیف کیا تھا۔'' ۲

قصہ رنگین گفتار کے بعد راجستھان میں مرزا اکبر علی بیگ گل کی تصنیف ''قاطع الشرک'' اہم ہے۔

اردو نثر میں جہاں ایک طرف الطاف حسین حالؔی، سرسیدؔ، علامہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمدؔ نے جدید نثر کی بنیاد قائم کی۔ سرسیدؔ اور حالؔی نے معاشرے کو سائنس اور جدید علم سے روشناس کرایا تو نذیر احمدؔ نے اپنے ناولوں کے ذریعہ سماج میں اصلاح کا کام کیا۔ اسی کے ساتھ راجستھان میں بھی کئی موضوعات پر نثری تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں تاریخ، ادب، قانون، طب، شرع وفقہ وغیرہ شامل ہیں۔ ٹونک میں نواب ابراہیم علی خان کا دور اردو نثر کے لیے ایک سنہرا دور تھا۔ جس میں کئی کتابوں کے تراجم کئے گئے اور کئی کتابیں منظر عام پر بھی آئیں۔

۱۹۰۱ء میں استاد آبرؔو نے ٹونک کی تاریخ ''حدیقۂ راجستھان'' کے نام سے مرتب کی تھی۔ اس کے علاوہ ماسٹر حامد علی نقوی نے نثر میں ''تاریخ ناصری'' لکھی تو صاحب زادہ عبدالتواب خان نے ''تذکرہ ٹونک'' ۱۹۳۷ء میں لکھی تھی۔ ٹونک کی ادبی فضاؤں میں شعری اور نثری، تاریخی، تحقیقی، تنقیدی، مذہبی، علمی تصانیف کے علاوہ افسانے اور دیگر اصناف میں بھی تصانیف منظر عام پر آئی تھیں۔

موجود دور میں ٹونک کے ادبی ماحول نے نئی نسل کو بھی متأثر کیا اور ان کو ادبی دنیا سے وابستہ کیا۔ کالج کے ایسے کئی طلباء تھے۔ جنھوں نے افسانہ نگاری میں ایک خاص مقام پیدا کیا۔ جن میں مختارؔ ٹونکی کا نام سر فہرست ہے۔ ویسے تو وہ ادبی دنیا میں طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے اس ادبی سفر کا آغاز ۱۹۶۰ء میں ہی افسانہ نگاری سے کر دیا تھا۔

مختارؔ ٹونکی کی ادبی خدمات اور ان کے کارناموں کا جب غائرانہ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ادبی کاوشیں مختلف جہات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ نثر ہو کہ نظم انھوں نے تمام ہی اصناف ادب میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ وہ ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور غیر معمولی ذہانت کے بنا پر وہ ایک طویل مدت سے چمنستان ادب میں گل

افشانی کر رہے ہیں۔ وہ ایک مستند اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار، مضمون نگار، انشائیہ نگار، تنقید نگار، محقق اور تبصرہ نگار و طنز و مزاح نگار ہیں۔ اپنی اس صلاحیت کے نقوش انھوں نے ہر جگہ چھوڑے ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مختار ٹونکی نے نثری ادب کی ابتداء بچوں کے ادب سے کی تھی۔ بچوں کے ادب میں خامہ فرسائی کرنے کے بعد وہ افسانہ نویسی کی طرف مائل ہوئے تو ان کا پہلا ''افسانہ ملکہ دولت'' ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد ''ہلال عید'' ''کاش میں لڑکا ہوتی''، ''آزمائش''، ''تلخیاں''، ''شومئ قسمت''، ''انوکھا چور''، ''من پھولی کا راز''، ''جب کھیت سو گئے''، ''کتنی بلندی کتنی پستی''، ''اتفاقات ہیں زمانے میں''، ''شاخسانہ'' جیسے متعدد افسانے متواتر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے ان افسانوں میں زندگی کی حقائق اور سماج کے گرد و پیش کے حالات کی جھلک ملتی ہے ان میں خاکوں کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔

افسانوی ادب میں انھوں نے اپنا رنگ دکھانے کے بعد انشائیہ نگاری کی طرف توجہ کی اور بہترین اور کامیاب انشائیہ لکھ کر اپنی صلاحیت کے جوہر دکھائے جو دنیائے ادب میں توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ماہنامہ آج کل دہلی، راشٹریہ سہارا نوئیڈا، بیسویں صدی دہلی، پرواز ادب پٹیالہ، ماہنامہ روشنی امریکہ جیسے رسائل میں ان کے انشائیے شائع ہوئے ہیں جو کہ قاری کو فرحت و انبساط کے ساتھ بھی غور و فکر کرنے کے دعوت دیتے ہیں کیونکہ ان کے انشائیوں میں اطمئنان اور سکون کے ساتھ ساتھ طنز کا تیکھا پن بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مختار ٹونکی کی پہچان ایک طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے ہے۔ جس طرح ان سے قبل مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مزاحیہ مضامین کے ذریعہ دنیائے ادب میں عالمی سطح پر ایک مقام حاصل کیا ہے اور قبولیت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ بنائی ہے۔ اسی طرح سے مختار ٹونکی نے بھی اپنے صلاحیت کے ذریعہ طنز و مزاح نگاری کے میدان میں اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے۔ انھوں نے سماج کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور طنز و مزاح کے تیر چلائے ہیں۔ انھوں نے عہد جدید کے فکری تقاضوں اور جد جہد کو اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات

اوراحساسات کوسامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ان کی تحریروں میں کلاسیکی رنگ بکھرا پڑا ہے۔اسی لئے وہ اس کے اظہار کے لئے بیانیہ اسلوب کے ساتھ سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں۔وہ منتخب مواد اور موضوع لے کر اس کے واقعات کا بیان بڑے ہی دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔

طنشائیہ

طنز ومزاح کے میدان میں ان کے پانچ مجموعے اوٹ پٹانگ ؛لغویات ،خرافات،مزخرفات اور ہفوات دھوم مچا رہے ہیں۔طنزیہ قلم کار کے طور پر اردو ادب میں ذخیرے کے ساتھ ساتھ ان کے سر پر اردو میں ایک نئی صنف کے اختراع کا بھی سہرا ہے۔انھوں نے اپنے انشائیوں کو طنز ومزاح کے ساتھ ملا کر ایک نئی صنف ایجاد کی ہے اور وہ ہے طنشائیہ یعنی اپنے طنز کو انشائیے کی چاشنی میں لپیٹ کر دیا ہے تاکہ قاری کو گراں بھی نہ گزرے اور وہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں۔

ان کے مزاحیوں میں طنز کا تیکھا پن،مزاح میں چاشنی کے ساتھ انشائیوں کی شگفتگی بھی شامل ہے۔ان کے مزاحیہ مجموعوں میں شامل تین مجموعے خرافات ، مزخرفات ،اور ہفوات جن کو انھوں نے طنشائیہ کا نام دیا ہے ان تینوں میں مذکورہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

مختارؔ ٹونکی بنیادی طور ہر طنز نگار رہی ہیں وہ طنز کے نشتر اس چابک دستی سے چلاتے ہیں کہ اس میں مزاح کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔طنز کے تیروں میں مزاح کی شگفتگی ان کی تحریروں کو بوجھل نہیں ہونے دیتی ہے۔

بقول مسعود اختر :۔

''طنز میں وہ میر یڈھ کے پیرو ہیں۔''[۳]

اپنی طنز نگاری اور طنشائیے پر اپنی رائے کا اظہار وہ خود اس طرح سے کرتے ہیں کہ

''طنز اور انشائیے کو اس طرح گڈ مڈ کیا ہے کہ شیر وشکر کی طرح سے دو جان یک قالب ہو گئے ہیں۔اور اسے طنشائیہ کا نام دے کر اردو میں ایک نئی صنف کا اضافہ کر دیا ہے طنشائیہ کے مجموعہ 'لغویات' میں ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں

کہ فاصد مواد چاہے ادب میں ہو یا پھر سماج میں اس کو بہر حال نکالنا ہی چاہیئے ،
چرکہ لگے گا تب ہی تو فاسد خون بہے گا۔''[۴]

محمد احمد دانش دوانوی اپنے مضمون منفرد مزاح نگار مختار ٹونکی (گلستان ادب حیدر آباد) اگست ۲۰۱۷ء میں شائع طنشائیہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''مختار ٹونکی نے ان مضامین کو طنشائیہ کا نام دیا ہے یعنی طنز اور انشائیہ۔ جو اپنے اندر طنز کا تیکھا پن بھی رکھتے ہیں اور انشائیوں کی مٹھاس بھی دیتے ان کے مضامین کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے انشائیوں کے مختلف جوہر بے تکلفی، سادگی، خود کلامی، موضوعات کا تنوع، رنگینی وظرافت، شوخی و لطافت، وسعت فکر ونظر اور داخلی غنائیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ساتھ ہی ان مضامین میں کرداروں کی سیرت، مزاج وافکار و، نفسانی اور جبلی اطوار کی آمیزش نے خاکوں کے حسن کو اور بڑھا دیا ہے۔''

ان کی ادبی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے مسعود اختر آگے کہتے ہیں کہ:

''جناب مختار ٹونکی کسی ناقد، شاعر، تنقید نگار اور مزاح نگار کی سہ شخصیات میں سے خوب تر کی تلاش بڑا مشکل کام ہے۔ وہ کم گو ہیں مگر بات میں گہرائی رکھتے ہیں۔ وہ انقلابی نہیں لیکن کچھ سنہرے ڈھنگ دار خواب ضرور پالتے ہیں۔ وہ گھنے اور سایہ دار درختوں کے نیچے راحت کوشی کے ساتھ بے آب وگیاہ صحراؤں کی خاک چھاننا بھی صحت کے لیے مفید مانتے ہیں وہ کثافت کو لطافت اور لطیف تر میں تبدیل کرنے کا جگر اور ہنر دونوں رکھتے ہے۔''[۵]

ایک نثر نگار کی حیثیت سے مختار ٹونکی کی تخلیقی شخصیت، فنی خصوصیات اور امتیازات کا تعین آئندہ کی سطور میں کیا جائے گا۔

مختار ٹونکی بہ حیثیت انشائیہ نگار

انشائیہ اردو ادب کی ایک ایسی نثری صنف ہے جس میں کسی مضمون، کسی خیال، جذبے یا کسی ذاتی تاثر اور ذاتی تصورات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ انگریزی ادیب جانسن کا انشائیہ کے بارے میں کہنا ہے کہ:

It is a loose sally of mind

'' انشائیہ ذہن کی ایک آزاد ترنگ ہے۔''

انشائیہ میں موجود ذہنی ترنگ دلچسپی اور دل پذیری کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں پیچیدگی یا سنجیدگی سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ اور انشائیہ نگار بڑی بے باکی اور بے تکلفی سے اپنے خیال اور احساس کا اظہار کرتا ہے۔ انشائیہ دو طرح کے ہوتے ہیں ذاتی اور شخصی۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی خیالات اور احساسات نیز اپنے تجربات و مشاہدات کے ساتھ ہر وہ چیز جس سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ اس میں وہ اپنے جذبات و خیالات اور احساس کی روانی کے ساتھ بیان کر کے اس میں خوش آہنگی پیدا کرتا ہے۔

انشائیہ کی تعریف میں ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں کہ:

''انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہر کرتے ہوئے اشیاء کے مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے انداز کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''[۶]

ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک انشائیہ کا مقصد محدود ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ انشائیہ نگار کا خیال مقصد بالذات ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ انشائیہ نگار شئی یا خیال سے کاٹ کر مقصد بالذات قرار دیتا ہے اور یوں قطرے میں دجلہ دریافت کرتا ہے۔

ڈبلیو ای ویلیم انشائیہ کا تعریف اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

''انشائیہ بالعموم نثر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے جو کہ بیانیہ کے لیے وقف نہیں

تاہم انشائیہ نگار نکتہ آفرینی کے لیے چھوٹے سے واقعے کو بھی استعمال کرسکتا ہے۔انشائیہ نگار کا بڑا مقصد کہانی کی پیش کش نہیں بلکہ انشائیہ نگار تو معاشرے کا فیلسوف نقاد اور حاشیہ نگار ہے''۔ے

مختار صاحب کا پہلا مجموعہ ''اوٹ پٹانگ'' جو کہ ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا تھا۔جس میں پندرہ مضامین شامل ہیں جو نہ صرف عنوان بلکہ موضوع کے اعتبار سے بھی منفرد وممتاز ہے۔جس کا پیش لفظ اردو کے جانے مانے طنز نگار مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے۔وہ ان کی خاصیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''مختار ٹونکی کی یہ خوبی ہے کہ وہ اردو کے کلاسیکی ادب کا گہرا ادراک رکھتے ہیں اس لئے انھیں زبان پر وہ بھرپور عبور حاصل ہے جس کے بغیر کوئی بھی مزاح نگار اپنی شناخت نہیں بنا سکتا۔''

اسی خصوصیات کے بیان کے ضمن آگے کہتے ہیں کہ:

اس انشائیہ کی ساری خوبی زبان کی چاشنی میں مضمر ہے۔مختار ٹونکی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اپنے تیز مشاہدے اور ذہانت کے ذریعہ اس کے سارے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کردیتے ہیں۔''۸

ان کے انشائیوں میں خوش گواری کا مادہ تو ہے ہی لیکن وہ اسی خوش گواری کے ساتھ نصیحت اور اصلاح کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔اوٹ پٹانگ میں شامل مضامین کے بارے میں انیس دہلوی اپنے حرف چند میں لکھتے ہیں کہ:

''اوٹ پٹانگ میں انشاء،طنز اور مزاحیہ مضامین کا تگڑم پیش کیا گیا ہے۔جس میں زندگی کے مختلف رنگ ہیں اور مختلف انداز بھی!تلخیٔ غم جب لذت حیات کو ناخوشگوار بنا دیتی ہے۔تب شگفتہ تحریر تھوڑی دیر کی خوش دلی پیدا کر کے از سر نو تازگیٔ حیات عطا کرتی ہے،اوٹ پٹانگ کا یہی وصف ہے کہ پڑھنے والا جتنی دیر ہنسنے ہنسانے میں رہتا ہے۔اتنا وقت وہ روزمرہ کے غموں سے الگ ہو کر زندگی کی بھیانک تصویر کے

بجائے۔اس کے حسن و دلکش رخ کو دیکھتا اور خوشی خوشی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے''۔۹

اوٹ پٹانگ کا پہلا مضمون 'ن سے ناک' (قصۂ ناک سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم) میں انھوں نے ناک کا مختلف انداز سے تذکرہ کیا کہ ایک ناک ہی انسان کی پہچان اور شان ہوا کرتی ہے جو عزت بڑھا بھی دیتی ہے اور کم بھی کر دیتی ہے۔شاعر اور ادیب کی ناک کے مختلف النوع نقشے بیان کئے ہیں،فکر تونسوی نے کنہیا لال کپور کی ناک کا اس طرح سے نقشہ بیان کیا ہے کہ ناک کے پورے نقشے پکڑتے پکڑتے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ناک نہیں بلکہ رخسار ہے اور پھر رخسار پر نگاہ دوڑائی جائے تو وہاں آنکھ کا سا عالم طاری دکھائی دیتا ہے .....ویسے اگر عام فہم انداز میں کہا جائے تو ایک مٹ میلے سے چہرے پر لمبی سی ناک دکھائی دیتی ہے۔۱۰

اس کے علاوہ موصوف خود اپنی آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

> لڑکپن میں ہم نے ایک جوان العمر محترمہ کو دیکھا تھا۔جن کی نصف ناک کٹی ہوئی تھی سب ان کو نکٹی کہہ کہہ کر چھیڑتے تھے۔یہ اچھی خاصی خوبصورت عورت بھوتنی لگتی تھی اور اسے دیکھ کر ہمیں ہول آتا تھا۔کیونکہ دونوں نتھنے اجنتا کی غار معلوم ہوتے تھے۔۱۱

اسی مجموعے اوٹ پٹانگ کے دوسرے مضمون ''بیان موجودہ اردو ادیبوں کا'' میں اردو کے زوال اور موجودہ صورت حال پر طنز کرتے ہوئے جو عکس دکھایا ہے۔اس سے ہم کو اردو کے حال اور مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔وہ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ:

> ''فرض کرو کسی نے انگریزی زبان میں کیٹس پر کوئی بہترین مضمون سپرد قلم کیا اور اس کو بجنسہ اردو میں منتقل کر دیا اور جہاں جہاں کیٹس کا نام دہرایا گیا تھا وہاں اس کی جگہ اختر شیرانی کو ٹھونس دیا اگر کیٹس کی شاعری کے نمونے دیے گئے تو اختر شیرانی کے اشعار چسپاں ہو گئے لو! جناب عالی مضمون تیار ہو گیا اور ایک ادیب کی حیثیت سے پہچان ہو گئی۔تازہ واردان بساط ہوائے دل کہا سمجھ

سکتا ہیں کہ شاعر رومان کے دبیز پردے میں کون چھپا بیٹھا ہے۔''

مختار ٹونکی جب کسی موضوع پر غور وفکر کرتے ہیں تو اس کے سبھی پہلوکو زیرغور لاتے ہیں درج ذیل اقتباس سے ان کی اس فطری صلاحیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے:۔

''کہتے ہیں کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کونگل جاتی ہے۔مینڈک راجہ کیڑے مکوڑوں سے بریک فاسٹ کرتا ہے اور شیر وچیتے ہرن وغیرہ سے ڈنر اڑاتے ہیں مشیت ایزدی نے گوشت خور بنایا ہے تو اسی طرح سے ان کی شکم پری ہوتی ہے' جیو اور جینے دو' اور' اہنسا پرمودھرم' کے اصولوں کو وہ کیا جانیں۔ یہ سب کچھ تو انسان کی ذہنی اپج ہے۔غذائے لحمی سے احتراز کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ قدرت کی نعمتیں بے شمار اور بحر ناپیدا کنار ہیں اور امتیاز وتخصیص سے ہم جھٹلا نہیں سکتے۔''

''پیشے کی تلاش میں'' ملازمت سے سبک دوشی کے بعد آمدنی کے دوسرے ذرائع کے لئے پیشہ کا جو مشورہ دیا جاتا ہے وہ غور وفکر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔درج ذیل اقتباس تلاش روزگار کی طرف نشان دہی کرتا ہے:۔

''ہاں بھئی غسال (یعنی غسل میت کرانے والے) میں نے کہا تھا نا کہ تم اس کو مذاق سمجھو گے مگر دھیان سے سنو تو بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ یہ کوئی جوکھم کا کام نہیں ہے بس تمہیں طریقہ غسل میت کسی مذہبی کتاب سے دیکھنا ہوگا۔ آج کل تو ویسے ہی غسل میت کرانے والوں کی شارٹیج چل رہی ہے۔مردے انگلیوں میں چاندی کے چھلے اور سونے کی انگوٹھی بھی پہنے ہوتے ہیں موت ہونے پر اور غمی کے موقع پر گھر والوں کی توجہ اس طرف کم ہی جاتی ہے۔میت غسل کے کے دوران ان چیزوں پر قبضہ کیا جاسکتا ہے۔''[۱۲]

موصوف کا دوسرا مجموعہ ''لغویات'' ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آیا تھا۔اس مجموعے میں ان کے ۴۲ مضامین

شامل ہیں۔ مجموعے میں شامل مضامین کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے نثر پاروں میں ظرافت، بذلہ سنجی دوران مطالعہ قاری کو کھلکھلانے کے ساتھ سماج میں موجود برائیوں، بے راہ روی، اور گمراہیوں کے بارے میں سوچنے اور غور وفکر کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

انھوں نے اپنے اس مجموعے ''لغویات'' میں اپنے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو کھانے میں نمک سے مشابہت دی ہے کیونکہ جب تک کھانے میں نمک نہ ہو تو اس کا مزہ اور ذائقہ نہیں ہوتا ہے یعنی کھانے کی اہمیت اور ذائقہ صرف اور صرف نمک پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ اسی طرح سے مضامین کو دلچسپ اور پرکشش بنانے کے لیے اس میں طنز مزاح کا بگھار بھی ضروری ہے۔ اس بابت وہ کہتے ہیں کہ:

> ''عربی کا ایک مقولہ ہے کہ۔۔ ''الملح فی الکلام کالملح فی الطعام''
> یعنی کلام میں مس ظرافت خانم کو وہی درجہ اور اہمیت حاصل ہے جو ''طعام'' میں مسٹر
> نمک بہادر رکھتے ہیں۔۔۔ جب آپ اس کتاب کی نگارشات کو چکھنا چاٹنا شروع
> کر دیں گے تو عجیب عجیب ذائقہ پائیں گے۔ ہم نے صرف نمک پر ہی اکتفا نہیں کیا
> ہے بلکہ نمک مرچ لگانے کی حتیٰ المقدور بھرپور کوشش بھی کی ہے۔'' ۱۳

اس سلسلے میں موصوف کی رائے بالکل درست ہے کیونکہ ان کے مضامین کے عنوان دیکھ کر ہی اس ان کے ذائقے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جیسے ''عورت تیرا نام بے حیائی ہے''، ''لنگڑا ڈاکٹر''، ''عیش بن کیش''، ''اچھی عورت بھی کیا بری شئی ہے''، ''ماڈرن قصائی''، ''شیطان کی پینشن''، ''چونچیں''، ''لیٹ لطیفی''، ''فرضی جنازہ''، ''تہاڑ آشرم''، ''انٹرویو ایک فرضی تبصرہ نگار سے'' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو کہ سنجیدگی اور ظرافت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ مگر ان کو پڑھ کر کسی بھی پھکڑ پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

اسی مجموعے ''لغویات'' کے دیباچے میں موصوف خود اپنی اس طنز وظرافت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''جب کوئی تہذیب اپنی الٹی گنتی کرتے ہوئے تنزل کے آخری پائیدان پر قدم

رکھ دیتی ہے اور نام نہاد مہذب انسان ذات شریف کی شکل اختیار کر کے حیوانات کو خیز جاں بنالیتا ہے۔طنز پیشہ قلم کار انھیں انسانی حماقتوں، تہذیبی نالائقیوں اور ادبی بے ہودگیوں کو مضحکہ خیز بنا کر پیش کرتا ہے۔اب کہنے والے کہتے رہیں کہ یہ تو زخم لگا کر مرہم لگانا ہوا۔اجی جناب! فاسد مواد چاہے ادب میں ہو کہ سماج میں، اسے باہر نکلنا ہی چاہیئے۔چرکہ لگے گا تبھی تو فاسد خون بہے گا۔آپ خود لگائیں بخوبی اندازہ۔۔۔۔۔۔بہر حال یہ بھی گوش گذار کرلیں کہ ہم نے طنز کی جولانی میں متانت اور سنجیدگی کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھا ہے اور ادبیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا''ہم لائے ہیں لقمان سے چٹنی نکال کے۔''[۱۴]

اسی طرح سے معروف انگریزی ڈرامہ نگار شیکسپیئر کے فقرے''عورت تیرا نام بے وفائی ہے'' میں تصرف کر کے انھوں نے اپنے مضمون کا نام''عورت تیرا نام بے حیائی ہے'' رکھ کر عورتوں کی موجودہ صورت حال اور بے پردگی پر قلم اٹھایا ہے۔

اس مضمون میں انھوں نے عربی و فارسی کے الفاظ تراکیب اور محاورے کا استعمال کرتے ہوئے مزاحیہ عنصر پیدا کیا ہے۔اس کے چند اقتباس مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) موصوف کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے چھ دہائیوں میں نو نازنیوں کو النکاح من سنتی پر عمل کرتے ہوئے عقد کے جال میں پھانسا، مگر نو کی نو یکے بعد دیگر جال کو کتر کاٹ کر نو دو گیارہ ہو گئیں۔

(عورت تیرا نام بے حیائی ہے ص ۶)

(۲) باحیا مستورات مزید نوٹ کرلیں کہ ہم تو بچپن ہی سے غضب کے شرمیلے واقع ہوئے ہیں اور الحیاء من الایمان پر ہمارا مکمل ایمان ہے۔

(عورت تیرا نام بے حیائی ہے ص ۶)

(۳) چکنا گھڑا سینکڑوں چکنی گھڑیاں ہر کہیں ڈولتی مل جائیں گی اور آپ لفٹ دیں تو فوراً سرتاپا کھل جائیں گی۔ کیونکہ ان کے لیے مثل مشہور ہے کہ بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن۔

(عورت تیرا نام بے حیائی ہے ص۱۰)

(۴) اجی صاحب! جنازہ ہم سے چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ کل من علیہا فان یعنی نہیں یہ قصہ دل لگی کے لیے بلکہ عبرت ہے آدمی کے لیے۔

(فرضی جنازہ ص۱۲۶)

(۵) برسوں پہلے شیخ سعدی شیرازی نے رفع شر کے لیے کہا تھا کہ ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز'' یعنی کار جہاں دراز ہے اور دنیا کا کاروبار چلانے کے لئے ضروری ہے کہ مصلحت کو مدنظر رکھا جائے۔ (فروغ دروغ ص ۲۲ مزخرفات)

(۶) وترزق من تشاء بغیر حساب کا قرآنی سبق یاد رکھا ہے۔ ۱۵

(۷) حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را۔ ۱۶

اسی طرح سے ان کا ایک مضمون ''لنگڑا ڈاکٹر'' ہے جو کہ کسی ڈاکٹر کی جسمانی کمی کو ظاہر نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے آڑ میں انھوں نے ادبی ڈاکٹروں پر چوٹ کی ہے۔ جس طرح سے ایک ہاف ڈاکٹر جان کے لیے خطرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ادب سے کم واقفیت رکھنے والا بھی ادب کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ وہ اسی ہاف ڈاکٹر جو کہ ادب کے لیے خطرہ ہوتا ہے اس پر لکھتے ہیں کہ:

''ادبیات کے ڈاکٹر کسی طرف سے لولے لنگڑے ہوتے ہیں تو وہ اڑن طشتری کی طرح آل انڈیا میں گھومتے رہتے ہیں گرین کلر طوطے کی طرح سے رٹے رٹائے مقالے پڑھتے ہیں اور زراف کی طرح اپنی ٹانگوں کی بدولت قدآور ہوتے ہیں ان کو لنگڑا ڈاکٹر کہنا ہتک ادب ہے۔'' ۱۷

مختار صاحب کو زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہے اور وہ اپنی تحریروں میں عربی ، فارسی ، کے بھاری بھرکم الفاظ اور محاوروں کے استعمال سے اس کا حسن بڑھا دیتے ہیں ۔ ان کے اس زبان و بیان کے عبور پر مسعود اختر کا کہنا ہے کہ:

''مختار صاحب کے یہاں پر بھاری بھرکم الفاظ کے ساتھ عربی و فارسی کی ترکیبیں شعر، مصرعے اور قول جگہ جگہ نظر آتے ہیں جو آج کے نوجوان اردو پڑھنے والوں پر گراں گزرے لیکن دھیرے دھیرے رخصت لیتی یہ تحریریں ہمیں بتاتی ہیں کہ کلاسیکی زبان کیا ہوتی ہے ۔ اس میں کتنا رچاؤ ہوتا ہے اور ایسی زبان میں رچے ادب میں کتنی گہرائی اور معنویت ہوتی ہے ۔ پختگی ایسی کہ جیسے حویلیوں اور عمارتوں میں گھرٹ کو چونا ، جو ہزاروں برساتوں میں بھی دیواروں میں شگاف نہیں پڑنے دیتا ۔ زبان و بیان کی اسی زبردست قدرت نے مختار صاحب کے ادب میں بہ شکل پیروڈی بیش بہا اضافے کئے ہیں ۔'' ۱۸

ان کے ایک اور مضمون ماڈرن قصائی میں انھوں نے ایسے ڈاکٹروں کا تعارف کرایا ہے جن کا پیشہ لوگوں کی خدمت کرنا نہیں بلکہ لوٹ کھسوٹ کرنا ہے اور پیسے کے لالچ میں مریض کو خستہ حال کرنا ہے اس سلسلے میں ماڈرن قصائی کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے :۔

''ماڈرن قصائی سے ہماری مراد آج کل کے ڈاکٹر سرجن وغیرہ سے ہے جو شکل و صورت سے بھی بوچڑ نظر آتے ہیں جنھوں نے اسپتالوں کو بھی بوچڑ خانہ بنا دیا ہے ۔ میٹ بازار میں بھی اتنی سڑاند نہ ملے گی جتنی کہ اسپتال کے احاطے میں ملے گی ۔' ۱۹

موصوف کے انشائیہ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مضامین کے درمیان اشعار کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ موصوف کے کلاسیکی ادب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اس وجہ سے قدیم شعراء کے اشعار کا جا بجا استعمال کر کے اپنے انشائیوں کی شان بڑھا دیتے ہیں کہیں کہیں تو وہ اشعار کے الفاظ کو ہی اپنے انشائیے کا

عنوان بنا دیتے ہیں۔مثلاً ان کے مضمون مائی ڈیر بٹیر ہاف کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''عورت ذات کو ناقص العقل بھی ٹھہرا دیا جائے اور ''ب'' سے بیوی بن جائے
تب بھی اسے بٹیر ہاف ہی سمجھا جائے گا۔ یہ تو آدھا تیتر آدھا بٹیر والی بات ہوئی۔''
آمد برسر مائی بٹیر ہاف ۔۔۔۔۔ مجھ کو دو خامہ و قرطاس جو کچھ لکھ پاؤں،

﴿ مختار ٹونکی بہ حیثیت طنز و مزاح نگار ﴾

انسانی زندگی میں خوشی اور غم دونوں پہلو نمایاں طور پر شامل ہوتے ہیں۔مگر انسان غموں پر خوشی کا ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ غم و اضطراب کی کیفیت انسان کے اندر الجھن اور نا آسودگی پیدا کرتی ہے وہیں مسرت بھرے لمحے اور ہلکی سی مسکراہٹ سے انسان غم بھول جاتا ہے۔اسی لیے انسان کی زندگی میں مسرت اور خوشی کی بڑی اہمیت ہے۔

مزاح ایک فطری احساس ہے جو کہ مسرت اور خوشی کے احساسات پر منحصر ہوتا ہے۔ وہیں شدید طنز کی کیفیت بھی انسانی مزاج کا احاطہ کرتی ہے مگر ادب میں اگر خالص طنز ہو تو وہ بوجھل ہو جاتا ہے اور خالص مزاح بھی انسان کو اکتا دیتا ہے۔اگر ادب میں طنز کے ساتھ ساتھ مزاح کو بھی شامل کر دیا جائے تو اس سے قاری میں لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر غور و فکر کرنے کے بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

طنز و مزاح کی تاریخی حیثیت پر اگر غور کیا جائے تو اردو ادب میں ابتداء ہی سے طنز مزاح کے نقوش ملتے ہیں۔اس کے ابتدائی نقوش ہم کو داستانوں میں ملتے ہیں مگر ان کی عبارت مقفیٰ او مسجع ہوتی تھی۔اس میں فقرہ بازی طعن و تشنیع زیادہ اور ظرافت کے نمونے کم ہی ملتے ہیں۔ غالب کے خطوط اور اودھ پنچ اخبار نے طنز مزاح میں سادگی کا استعمال کر کے اس کو فروغ دیا۔ بقول وزیر آغا :۔

''اودھ پنچ نہ صرف اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا بلکہ اس نے پہلی بار اردو میں مغربی
طنز و مزاح کے حربوں کو بھی استعمال کیا دوسری یہ کہ سیاسی اور مجلسی مسائل پر بھی
بھرپور طنز کا آغاز ''اودھ پنچ'' ہی سے ہوتا ہے۔''[۲۰]

طنز ومزاح نگاری کو وسعت عطا کرنے میں احمد شاہ پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی فکر تونسوی، کنیہا لال کپور، کرشن چند، مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی (جن کا بھی اتفاق سے ٹونک ہی سے تعلق تھا) نے طنز مزاح کو بین الاقوامی سطح پر شہرت عطا کی۔ موجودہ دور میں طنز ومزاح کی اس روایت کے امین بن کر مختار ٹونکی دنیائے ادب میں اس کی بقا اور تسلسل کے لیے کوشاں ہیں۔ جن کا تعلق بھی ٹونک ہی سے ہے۔ اس صنف میں انھوں نے اعلیٰ ترین اور بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ جن کے لیے ان کے مجموعوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے ہم وطن ہونے کے وجہ سے مختار ٹونکی بھی طنز ومزاح میں ان کے معتقد نظر آتے ہیں اس ہم وطنی اور اعتقاد کے ساتھ ساتھ دوسری خوبی مسعود اختر یہ بتاتے ہیں کہ:۔

> ''دونوں ہی مزاح میں ہزل، تضحیک، تذلیل، پھکڑ بازی، رکیک، پوچ، فحش اور ادق گوئی سے سخت پرہیز کرتے ہیں۔ تیسری صفت یہ ہے کہ دونوں ہی شگفتہ طنز، خالص مزاح، فکاہات، تعریض، لطیفہ، ایجاز، رعایت لفظی، پیروڈی بذلہ سنجی، خاکہ، شوخ بیانی، قلقاری، کے ستھرے ذوق سے قاری کو مسکرانے کی ہمت دیتے ہیں۔''

خزاں کے دور میں جو مسکرا نہیں سکتے وہ لطف فصل بہاراں اٹھا نہیں سکتے'' [۲۱]

اس اقتباس سے مختار ٹونکی کی طنز اور ظرافت کے تعلق قدر اور تعین کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کس طرح فراخ دلی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی جادو بیانی کا ثبوت دیا ہے۔

طنز ومزاح نگاری کو اگر چہ ادب میں دوسرے درجے کا ادب سمجھا جاتا ہے۔ پھر بھی اس کے اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ ہم رونالڈ ناکس (Ronald knox) کے اس فقرے سے لگا سکتے ہیں کہ:

> ''مزاح نگار خرگوش کی طرح بھاگتا ہے لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔'' [۲۲]

اس بات کی وضاحت مختار ٹونکی صاحب اپنے مجموعے ''اوٹ پٹانگ'' کے ابتدائیہ میں اس طرح کرتے ہیں کہ:

''ہم نے دونوں میدانوں میں چھلانگ لگائی ہے۔یعنی رونالڈ ناکس کے مطابق خرگوش کے ساتھ بھاگے ہیں اور کتوں کے ساتھ شکار بھی کھیلا ہے اور وزیر آغا کے لفظوں میں ہر دو طرح ہنسنے کی پریکٹس بھی کی ہے۔'' ۲۳

مختار ٹونکی کا مقصد صرف طنز کرنا ہی نہیں ہے بلکہ سماج میں پھیلی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کو بھی ظاہر کرنا اور ان کی اصلاح کرنا ہے۔ان کی نثر میں کاٹ کرنے کا مقصد انحطاط اور ناسازگاری کا اختتام کر کے سماج میں خوشی وانبساط، محبت اور خلوص اور فرحت ومسرت کی فضاؤں کا غلبہ کرنا ہے۔

اسی طرح سے ان کے مضمون ''ہمیں شکایت ہے'' جو ان کے مجموعے ''خرافات'' میں شامل ہے میں انھوں نے معاشرے کی ان ناگواریوں پر شکایت کی ہے۔جو ہم قدم قدم پر دیکھنے کو ملتی ہیں مگر عام طور پر وہ نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔موصوف نے ان شکایتوں کا بیان کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ:

''ہمیں شکایت ہے ایسے سگریٹ، بیڑی کے شوقین حضرات سے۔جو اپنی تمباکو کی اگربتی ہر جگہ سلگا لیتے ہیں اور کش پہ کش لگا کر دھوئیں کے مرغولے بناتے ہیں۔'' ۲۴

''ہمیں شکایت ہے ایسے ویسے پڑوسیوں سے۔جو حق ہم سائیگی استعمال کرتے ہوئے صرف مانگے کے اجالے سے اپنے گھر میں روشنی کرتے ہیں۔''

''ہمیں شکایت ہے ان مسلم خواتین سے جو برقع سے اپنا منھ ڈھانپ کر مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتی ہیں۔اور نماز ختم ہونے پر ''بھائی جان کچھ دیتے جاؤ اللہ بھلا کرے گا'' کی رٹ لگاتے ہوئے نمازیوں کو تنگ کرتی ہیں اور ان کے خشوع

وخضوع کو بھنگ کرتی ہیں۔۲۵

ہمیں ایسے مسافروں سے بھی شکایت ہے جو چلتی کا نام گاڑی دیکھتے ہی اگاڑی نہ پچھاڑی بس اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی اسے بستر استراحت سمجھ لیتے ہیں۔''۲۶

''اختلاف زندہ باد'' مذہب کے نام پر ہونے والے اختلافات کی رنگا رنگی کو ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

''کہیں ہر ہر مہادیو ہے تو کہیں گھنشیام ہے پھر دو چار نہیں، دس بیس نہیں۔ خدا نظر بد سے بچائے پورے تینتیس (۳۳) کروڑ دیوی دیوتا ہیں۔ شوقئی قسمت سے ایک ایک دیوتا بھی اکثریت کے حصے بخرے میں نہیں آتا ہے۔ خورد ونوش اور لباس و پوشاک کو دیکھو کہ رسم ورواج کے آئینے میں جھانکو یہاں بھی اختلاف کی جھلکیاں ملیں گی کوئی گھانس پوس کھا رہا ہے تو کوئی روٹی بوٹی اڑا رہا ہے۔ ادھر دال باٹی چورما ہے، تو ادھر انڈا، مچھلی قورمہ ہے۔''

اس کے علاوہ ایک دوسرے اقتباس میں بھی ان کی طرز اسلوب پر نگاہ ضروری ہے:

''طرفہ تماشا یہ کہ یہاں کی اقلیت بھی اختلاف کا شکار ہوگئی ہے۔ بہتر (۷۲) فرقوں کا سجا ہوا بازار ہے۔ شیعہ اور سنی میں جو تم پیزار ہے تو بریلوی، دیوبندی میں کشتم پچھاڑ ہے، ارے یہ کون چلایا ''میں لیگی ہوں''۔ ارے یہ کون ڈکارا'' میں جماعتی ہوں'' علماء کی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ ہے گرچہ ان کے ہاتھوں میں قوم کی ٹوٹی پھوٹی باگ ہے۔''۲۷

مختار ٹونکی ایک طبیب کی مانند ہیں۔ جو ہمارے معاشرے اور عوام میں موجود نفرت اور اختلاف کو درست کرنے کے لیے قلم کو نشتر بنا کر جراحی کا کام لیتے اور بیماری کا سد باب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا مطالعہ اپنے گہرے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کیا ہے،۔ سماج کی تمام تر برائیوں،

خامیوں اور کمزوریوں کو اپنی تحریر میں پرکھا اور برتا ہے ۔انھوں نے اپنے موضوعات کا مواد سماج کے افراد کی زندگیوں سے اخذ کیا ہے۔ایک ادیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر دم چوکنا رہے اور وہ سماج کی اصلاح کا کام انجام دے سکے اور لوگوں میں وہ احساس پیدا کر سکے کہ وہ اپنی کمزوریوں کا علاج کر سکے۔

موصوف نے اپنی طنز ومزاح نگاری میں اپنے عہد کی صورت حال کا بھی بیان کیا ہے۔انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے زندگی کے معاملات اور واقعات کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ہر ادیب اپنے عہد کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔اور اس کی تحریر میں اس کے عہد کی جھلکیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔جو اپنے عہد کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔

اسی طرح رشوت ہمارے سماج میں ایک گرگٹ کی طرح سے ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے سامنے الگ الگ رنگ روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔کہیں ڈونیشن کے نام پر تو کہیں کمیشن کے نام پر تو کہیں ایڈجسمنٹ کے نام پر رشوت لی جاتی ہے۔انھوں نے رشوت کے مختلف طریقوں کا جزیوں نکالا ہے۔

'ر' سے روپیہ''ش' سے شکرانہ''و' سے وظیفہ''اور 'ت' سے تحفہ''اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔اس طرح کی مثالوں کے ساتھ رشوت کا دوسرا پہلو بھی دکھاتے ہیں کہ:

> ''اگر آپ کسی مندر میں قدم رنجہ فرمائیں یا کسی بزرگ کے مزار مقدس کی زیارت کریں تو آپ کو دوشیزۂ رشوت کا جمال دل فروز دیکھنے کو مل جائے گا۔بھکت جن اور عقیدت مند جو بھینٹ چڑھاتے ہیں وہ خالص دیسی گھی کی طرح خالص رشوت ہے۔بھگوان کو بھوگ مفت میں نہیں دیا جاتا ہے اور پیر فقیر کی تربت پر کوئی چڑھاوا بغیر منت کے نہیں ہوتا ہے۔''۲۸

''پیٹ اور پلیٹ''میں انسانی زندگی کی مجبوریوں اور روزگار کے کھیل پر جو طنز کیا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سماج کتنا پچھڑا ہوا ہے:۔

> '' یہ پیٹ ہی تو ہے جو اتاشی کو بھی راشی بنا دیتا ہے اور نادار کو زردار کے قدموں

پر جھکا دیتا ہے۔عورت اپنی حرمت وعصمت بیچتی ہے تو پیٹ کی خاطر.....آپ
ہمیں بتائیں کہ لوگ قومی سطح پر بھکاری کیوں بنے ہوئے ہیں؟ اور ہمیں سمجھائیں
کہ کچھ لوگ بین الاقوامی سطح پر کھلاڑی کیوں بنے ہوئے ہیں۔ یہ چیریٹی چندہ وندا
کیا ہے؟ سب پیٹ کا گورکھ دھندہ ہے۔ یہ نذرانہ چڑھاوا کیا ہے۔ پیٹ و پلیٹ
کا بلاوا ہے''۔۲۹

اسی طرح سے انھوں نے سیاست کے کھیل کو کھیل کے انداز میں پیش کیا ہے اور کہتے ہیں کہ:

''گلی ڈنڈا، کبڈی اور آنکھ مچولی تو پرانے بچکانے کھیل ہیں،۔انڈیا میں ان دنوں
سیاسی کھیل بھی بہت پاپولر ہے۔اٹھ اپنی کمر کس، سیاسی ہتھکنڈے سیکھ کر اتر جا
میدان سیاست میں۔ بہت جلد جغادری کھلاڑی بن جائے گا اور خوب نام و
دام کمائے گا۔''۳۰

''بس گھوٹالے ہیں کھیل کی جان ہیں۔''۳۱

''سیاسی کھیل بھی شطرنجی کھیل کی طرح ہیں۔اس میں باقاعدہ بساط بچھانی پڑتی ہے، الٹی سیدھی چالیں چلنی پڑتی ہیں، کبھی پیادے کو پٹخنی اور کبھی گھوڑے کو لڑھکنی دے کر شاہ کو شکنجے میں کسنا ہوتا ہے۔تبھی مخالف کو مات کا مزہ چکھایا جا سکتا ہے۔''۳۲

مختار ٹونکی نے اپنے مجموعوں میں اردو ادب کے کینوس پر اپنے طنز کے تیر چلائے ہیں اور اردو ادب کے کساد بازاری کا بھی اپنے مضامین میں اچھوتے انداز سے تذکرہ کیا ہے۔''مثلاً چلو فیکٹری میں ادب تخلیق کرنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔''

''میں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں لیکن دنیائے شاعری میں قدآور ہوں۔۔...
پورا مست قلندر ہوں ۔شہر شہر میں نعرہ ہے شریر بندر ہمارا ہے، پروفیسری تو پیشہ
ہے، شاعری میں پیسہ ہے یونیورسٹی سے غائب رہتا ہوں، مشاعروں میں حاضر

ہوتا ہوں ۔ چند شعر سنا تا ہوں، ہزاروں روپیئے کما تا ہوں ۔خوب وارے نیارے
ہیں ۔شاعری میں پو بارے ہیں ۔قطب شمالی پر ہوآیا ہوں ۔ وہاں بھی جھنڈے
گاڑآیا ہوں، مجھ سے اچھا کون ہے؟ میرا جیسا کون ہے؟ میں ...میں ...میں' ۳۳

اردو مافیہ، انجمن تخریب اردو، پاپائے اردو، ادبی بے ادبی، ادبی آل راؤنڈر جیسے مضامین ادبی دنیا سے واقف کراتے ہیں ۔اس کے ساتھ ہی اردو کے رسالے کے معیار اور بازاری ہونے پر اپنے خیالات کا اظہار اپنے مضمون ''سالے یہ رسالے'' میں کرتے ہیں:

''مواد اور موضوع کے لحاظ سے انھیں معیاری وغیر معیاری ، ادبی و غیر ادبی کا درجہ دے لو تو بھی اندرونی اوراق کھولو تو پتہ چلے گا کہ سالے کچھ رسالوں نے تو ''سیاست'' کی اونچی دوکان سجا رکھی ہے اور کچھ نے ''مذہب'' کی آڑ لے کر دھما چوکڑی مچا رکھی ہے ۔کچھ پر ''فلمی'' بھوت بیتال کی طرح سوار ہے تو کچھ میں 'تفریحی' ادب کی وافر مقدار ہے ۔''

لو آؤ کہ ان رسائل کو رسوائے حکایت کرتا ہوں ۔ ۳۴

پطرس بخاری نے ''کتے'' لکھ کر اردو ادب کو کتے سے روشناس کرایا تو مشتاق احمد یوسفی نے 'آب گم' میں سبز مانا ہری اور مزہ میں کتے کی مختصر سی سوانح عمری بیان کی ہے ۔مختصر یہ کہ اردو ادب میں کتے پر کئی ادیبوں نے لکھا ہے ۔موصوف نے بھی اپنے مجموعے لغویات میں بھی ''دو پیروں کے کتے'' لکھ کر اشرف المخلوقات اور کتوں کا موازنہ کیا ہے ۔

''آج دو پیروں کے کتوں کا دور دورہ ہے ۔ان کی پرورش اور پرداخت کے لیے
سرکار نے جگہ جگہ ''ڈاگ ڈپارٹمنٹ'' کھول رکھے ہیں ۔۔۔قدرت نے تو پالتو
کتے پیدا کئے تھے لیکن حکومت نے فالتو کتوں کی بھی فوج کھڑی کر دی ہے ۔'' ۳۵

''اردو ادب میں کتوں کا درجہ'' کے عنوان سے لکھ کر اردو ادب میں کتوں کی خیر خواہی کو مکالمہ کے کے انداز میں کتیا سے گفتگو کو پیش کیا ۔ جو موصوف سے اردو ادب میں کتوں کا درجہ جاننا چاہتی ہے اور وہ کتوں

کے درجہ سے واقف کراتی ہے۔اس مکالمہ کا نمونہ پیش خدمت ہے:

''کتیا نے نہایت ہی خشمگیں نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور پھر نہایت ہی عالمانہ انداز انداز میں منھ کھول کر بولی ''کس کندہ ناتراش اور ادب ناشناس سے پالا پڑا ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نہیں متشاعر ہے۔ارے ایک پطرس کیا اور ان کے پر لطف مضمون کی ندرت کیا۔''

''اور بھی فن کار ہیں اردو میں پطرس کے سوا''

اور سنو! مسٹر ایکس وائی زیڈ۔اِٹ از ویری بیڈ۔جانے نہ جانے تو ہی نہ جانے ڈاگ تو سارے جانے ہیں۔لو تمہارے ہوش ٹھکانے لگاتی ہوں اور کچھ رشحات قلم سے واقفیت بہم پہنچاتی ہوں۔''[۳۶]

انھوں نے اپنے دل کی بات کتیا کے ذریعہ طنزیہ انداز میں کہی ہے۔

پیروڈی

مختار ٹونکی نے اپنی تحریروں میں پیروڈی اور تحریف نگاری سے بھی استفادہ کیا ہے۔جو دلچسپی سے بھرپور ہونے کے ساتھ مزاحیہ پہلوؤں میں اپنی بات کے واضح کرنے کے لیے بھی اضافہ کرتے ہیں۔جس کو پڑھ کر قاری بغیر مسکرائے نہیں رہ سکتا ہے۔اس ضمن میں درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

ہزاروں سال آٹا اپنی بے قدری پہ روتا ہے بڑی مشکل سے پایا ہے توے روٹی بن رتبہ [۳۷]

نان ہے تو جہان ہے پیارے [۳۸]

صرف مرغی پہ منحصر نہیں غالبؔ بیضہ مخصوص سب کا ہی مدور ہے [۳۹]

ڈھونڈو گے ہمیں کونوں کھدروں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم [۴۰]

یہ ان کی خوبی ہے کہ وہ بے تکی باتوں میں بھی تک پیدا کر کے قاری کی توجہ اپنی طرف کر لیتے ہیں۔ جہاں پر وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں وہیں پر وہ عربی و فارسی کے الفاظ، مثالیں اور

محاوروں کے استعمال سے اپنی تخلیقات میں حسن پیدا کرتے ہیں۔

موصوف اپنے مضامین کے عنوانات میں بھی اسی طرح کی تبدیلی سے مزاحیہ عنصر پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

حی علی الفلاح ۔ حی علی المزاح (مزاحیہ)

دریں چہ شک بلکہ سو بار دریں چہ شک

ٹی۔وی بنام بیوی ،خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہیں ۴۱

ماڈرن قصائی،خدا کی پریشانی،دو پیر کے کتّے،مویشیائی ادب ۴۲

پاپائے ءاردو،نیکر راج،ٹرک چھاپ شاعرے،پڑوار دو کھود و گھاس ۴۳

مشتاق احمد یوسفی کی ہی طرح مختار ٹونکی کے بھی پانچ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔جو کہ پوری طرح سے طنز و مزاح اور انشائیوں پر مشتمل ہیں۔بالفاظ دیگر وہ تمام طنشائیوں پر دلالت کرتے ہیں ۔جن کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہے:۔

۱	اوٹ پٹانگ	۱۹۹۴ء	تعداد مضامین ۱۵
۲	لغویات	۲۰۰۱ء	تعداد مضامین ۴۲
۳	خرافات	۲۰۱۵ء	تعداد مضامین ۴۳
۴	مزخرفات	۲۰۱۷ء	تعداد مضامین ۳۴
۵	ہفوات	۲۰۲۰ء	تعداد مضامین ۳۹

طنشائیوں کی چھٹی کتاب زیر اشاعت ہے۔جس میں مضامین کی تعداد ۳۵ ہے اس طرح سے ان کی کل مضامین کی تعداد دو سو آٹھ ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے متعدد مضامین مختلف رسائل و جرائد میں موجود ہیں اس سے ان کی ذہنی صلاحیت اور فکر کی بالیدگی کا پتا چلتا ہے۔فی الحقیقت وہ بہت خلاق ذہنیت کے مالک ہیں اور ایک طرح سے وہ آل ٹائم رائٹر بھی ہیں۔ان کا قلم ابھی بھی رواں دواں ہے اور بساط ادب پر ابھی بھی

وہ اپنی گوٹیاں پھینک رہے ہیں۔

﴿ مختار ٹونکی بہ حیثیت افسانہ نگار ﴾

اردو ادب کی نثر کی اصناف میں افسانہ نگاری کو غیر معمولی حیثیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ افسانے نے انسان کو حیات و کائنات سے وابستہ کر کے زندگی کا شعور عطا کرنے اور بہتر طریقے سے بسر کرنے کا ہنر عطا کیا۔ افسانے نے عصری زندگی سے استفادہ کیا۔ اس میں زندگی کی واقعات اور مسائل کو بیان کر کے زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو عیاں کیا ہے۔

ڈاکٹر پروین اظہر افسانے کی تعریف یوں بیان کرتی ہیں کہ:

''انسان کا زندگی اور کائنات سے قریبی تعلق پیدا کر کے زندگی کو سمجھنے اور اس کو بہتر طور پر گزارنے کا ہنر سب سے زیادہ اس نے عطا کیا ساتھ ساتھ انسان کی معاشی معاشرتی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تاریکی و روشنی کی عکاسی و ترجمانی جس طور سے افسانوی ادب میں ملتی ہے کوئی دوسری صنف اس خصوصیت کی متحمل نہیں ہوسکتی۔'' ۴۴

تصور کائنات افسانے میں اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ جس کے مطالعے سے قاری زندگی کی حقیقتوں سے روشناس ہوتا ہے۔ Milton crane نے افسانے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:.

The sudden unforgatable Revelation of character the vision of a world through another's eyes.The glimps of truth the cap true of a moment in time. All this the short story at its best is uniquely capable of conveying for in its very short ness lies its great strenght it an discover depth of meaning in the casual word or action. it can suggest in a page what could not be stated in a volume.

ترجمہ:۔ اچانک نا قابل فراموش کردار کا انکشاف، دوسرے کے نگاہوں سے کائنات کا خیالی نظارہ

حقیقت کا جلوہ ، برمحل تسخیر لمحہ ، ان سب کو ان کی بہترین صورت میں پیش کرنے کی صلاحیت مختصر افسانے میں ہے اس لئے کہ اس کے اختصار ہی میں ایک عظیم توانائی کا راز پنہاں ہے اور یہ اتفاقیہ لفظ یا عمل سے معانی کی گہرائیوں کا انکشاف کرتا ہے ۔ ایک صفحے میں وہ سب کچھ سمجھا جا سکتا ہے جو کہ ایک جلد میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ ۴۵

افسانے کے ایسی اور تاثیر اور توانائی نے اسے ہر زبان کے ادب میں مقبولیت دی ہے ۔ اردو ادب میں بھی اس کے نقوش بیسویں صدی ہی سے ملتے ہیں ۔ اردو میں اس فن کے موجد پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم ہیں ۔ جنھوں نے افسانے میں فن اور تکنیک کے اعتبار سے وسعتیں پیدا کیں ہیں اور ان سے انسانی اقدار کی ترجمانی کی گئی ہے ۔ وقت کے ساتھ جب ترقی پسند تحریک آئی تو اس میں بھی تبدیلیاں ہوئی اور افسانے میں سیاسی ، سماجی موضوعات کے ساتھ ہی روزمرہ کی زندگی کے موضوعات اور واقعات کو بھی پیش کیا جانے لگا جس میں کرشن چند ، سعادت حسن منٹو ، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین جیسے افسانہ نگاروں نے اس کو جلا بخشی ۔ ملک کے ساتھ ساتھ راجستھان کے اہل قلم حضرات نے بھی اردو افسانے کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔ یہاں پر افسانے کا ارتقاء انیسویں صدی عیسوی سے شروع ہو گیا تھا ۔ لیکن اس کا باقاعدہ آغاز تو بیسویں صدی کے آغاز سے ہوا تھا ۔ اس ضمن میں مولوی مجاہد الدین نسیم کا پہلا افسانہ ''جمیل'' ہے ۔ جس میں فن اور انداز بیاں کی کمی ہے ۔ راجستھان سے تعلق رکھنے والے عظیم بیگ چغتائی نے بھی افسانے کے فن کا آگے بڑھایا ۔ اس کے علاوہ راجستھان میں اردو افسانے کو فروغ دینے میں یہاں کے رسالوں کا بھی اہم کردار رہا ہے ۔ ان میں راجستھان اردو اکیڈمی کے جریدہ ''نخلستان'' میں افسانہ نگاروں کی نگارشات شائع ہوتی رہی ہیں ۔ ان میں سدرشن پالی ، حامد رشید ٹونکی ، کلیم الدین تجلی عثمانی ، خلیل تنویر ، حسیب کیفی ، مہندی ٹونکی کے ساتھ عزیز اللہ شیرانی اور مختار ٹونکی وغیرہ کی تخلیقات متواتر منظر عام پر آتی رہی ہیں ۔

مختار ٹونکی نے دیگر ادباء کی طرح سے افسانہ نگاری میں ایک مقام حاصل کیا ہے ۔ ان کے افسانے ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو جے پور کے اردو پروگرام''

کہکشاں‘‘ میں نشر ہوتے رہے ہیں۔موصوف افسانہ نگاری کی تمام جزئیات سے واقفیت رکھتے ہیں۔جن میں ایک تسلسل اور ربط دیکھنے کو ملتا ہے۔

موصوف اپنے بے پناہ صلاحیتوں اور غیر معمولی ذہانت سے سماج میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات کو اپنے افسانوں میں بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کے افسانے عہد جدید کے فکری تقاضوں اور جدوجہد کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔یہ اپنے کرداروں پر خاص توجہ دیتے ہیں اور کردار کی مناسبت سے ہی اس کے لیے زبان کا استعمال کرتے ہیں۔وہ قاری کو اپنے مکالموں کے ذریعہ باندھنے کا ہنر جانتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار وہ حقیقت پسندانہ انداز میں کرتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں ہمیں سماج اور معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔وہ سماجی برائیوں اور فسادات پر طنز کرتے ہیں۔مندجہ ذیل اقتباس اس کی وضاحت کرتے ہیں:۔

> ’’بستی میں دنگا بھڑک اٹھا، ایک فرقے کے لوگ دوسرے فرقے کے لوگوں کو مار کاٹ رہے تھے۔ آگ دھماکے، چیخ پکار اور بھاگ دوڑ سے ایک کہرام مچا ہوا تھا، لا اینڈ آرڈر، بنائے رکھنے کے لیے پولیس کے نوجوان گشت کر رہے تھے، ایک گلی میں دھوتی سنبھالتے ہوئے ہانپتا کانپتا قصبہ کا سیٹھ دوڑتا ہوا آیا اور وہاں پر کھڑے پولیس والوں سے بولا ارے جلدی چلو! وہ درندے میرا گھر لوٹ رہے ہیں، میری عزت آبرو خطرے میں ہے۔۔بھگوان کے لیے۔۔۔شاید وہ کچھ اور کہتا کہ تین ڈنڈے اس کی کھوپڑی پر پڑے۔ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ چکرا کر گر پڑا دوسرے ہی لمحے ایک ہاتھ اس کے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر کی طرف بڑھا دوسرے ہاتھ نے انگوٹھی پر قبضہ جمایا اور تیسرے نے اس کی کلائی پر بندھی گھڑی کھول لی۔بستی میں ابھی بھی درندے لوٹ مار کر رہے تھے۔ ۴۶

اسی طرح سے انھوں نے سلیکشن میں معاشرے کے نفسیاتی پہلو اور سطحی ذہنیت کی طرف اشارہ کیا ہے

کہ کسی کا انتخاب یوں ہی نہیں ہو جاتا ہے۔

''لیڈی سیکریٹری کا انٹریو دینے کے لیے پچاسوں لڑکیاں آئی تھیں، کسی نے یہ عہدہ حاصل کرنے کے لیے سفارش کا سہارا لیا تھا تو کسی کو اپنی تعلیمی ڈگریوں پر بھروسہ تھا چند ایک اپنے حسن کی وجہ سے امید لے کر آئی تھیں لیکن متعلقہ آفیسر نے ایک معمولی سی ناک نقشے والی لڑکی کو منتخب کر سب ہی کو حیرت کے ساتھ رشک بھی ہوا کہ آخر کس بنیاد پر اس کو چن لیا گیا' رمز انتخاب' منتخب لڑکی نے اپنی سہیلی کے پوچھنے پر اس طرح بتایا کہ۔۔ مجھے خود کو بھی امید نہ تھی کہ باس اتنے پیارے ہوں گے میں نے انٹریو کے دوران ٹیبل کے نیچے سے ان کے پیر پر اپنا پیر رکھ دیا تھا۔ شاید انھوں نے اشارہ سمجھ لیا ہو۔'' ۴۷

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی شخصیت مختلف الجہات ہے۔ جن میں موجودہ صوت حال سماجی اور نفسیاتی اور انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حقیقت پسندانہ اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے زندگی کی تلخ حقائق اور سچائیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں اتفاقات ہیں زمانے کے، ٹوٹتے دائرے، شاخسانہ، پرتی پھل، سانکل لگا دو، بات ایک رات کی، کتنی بلندی کتنی پستی وغرہ قابل ذکر ہیں۔

عارفہ سلطانہ مختار ٹونکی کا تعارف اس طرح کراتی ہیں:۔

''ان کی افسانہ نگاری کا آغاز دوران تعلیم کالج کی میگزین سے ہوا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''ملکہ دولت'' کے عنوان سے ۱۹۵۹ء میں ہفتہ وار پیام مشرق دہلی میں شائع ہوا تھا اس کے بعد ان کے متعدد افسانے مختلف رسائل وجرائد میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن میں خاتون مشرق، ایشیاء بیسویں صدی، نیا دور، جمنا تٹ، نخلستان اور آج کل وغیرہ میں شامل ہیں۔ ان کے افسانے آکاش وانی جے پور سے بھی آپ افسانے کے نشر ہوتے رہے ہیں۔ او ہنری اور چیخوف کے افسانے آپ کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے

اردو میں آپ کرشن چند سے متاثر ہوئے۔آپ کا شمار سینیر قلم کاروں میں ہوتا ہے۔

ٹونک کی ادبی سوسائٹی کیا آپ صدر ہیں آپ کے افسانے بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ ۴۸

اردو افسانہ چیخوف سے سب سے زیادہ متاثر رہا ہے۔چیخوف کی کہانیوں کے ترجمے اردو زبان میں خوب ہوئے ہیں۔چیخوف کے افسانہ نگاری کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے افسانے سے کلائیمکس کو نجات دی۔ ڈاکٹر جمال آراء نظامی چیخوف کے افسانہ کے خاصیت بیان کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ:

''چیخوف نے افسانے کو تہہ دار سوچ کر تحریک دینے والا گہرا اور جذبات سے پر بنایا اس نے مختصر افسانے میں داخلی کیفیت کے اظہار کے امکانات کو ایک لامتناہی وسعت اور ہمہ گیری عطا کر دی ہے ہم ان کے کرداروں کو چھو کر دیکھ سکتے ہیں۔'' ۴۹

موصوف نے بھی چیخوف کے انداز میں کسی مخصوص کردار اور واقعات کے بجائے زندگی کے روزمرہ کے معمولی واقعات و کرداروں کے انوکھے پن سے زندگی کا ایک نیا روپ ہمارے سامنے لاتے ہیں۔چیخوف کا انداز بیان مختار ٹونکی کے افسانوں میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔''برہدف'' کی کویتا کو جب اس کی ساس اور اپتی قتل کرنے کی سازش کرتے ہیں۔تو وہ انھیں سبق سکھانے کے لیے جو قدم اٹھاتی ہے۔اس کو موصوف نے اس انداز سے بیان کیا ہے:۔

''جب وہ مندر والی گلی کے آخری موڑ پر تھیں تو اچانک سامنے والی گلی سے ایک موٹر سائیکل سوار تیزی سے نکلا اور اس نے کویتا کی طرف نشانہ باندھ کر گولی چلا دی،مگر اس ناگہانی حملے سے پہلے ہی کویتا اچھل کر اپنی ساس کے پیچھے ہو گئی۔ پستول کی گولی اس کی ساس کی سر میں لگی اور وہ فوراً چکرا کر گر پڑی۔دوسرے ہی لمحے گولی کی آواز سن کر لوگ دوڑے اور گلی میں شور مچ گیا تھا۔صبح کے اخبار میں ایک سرخی تھی ۔۔۔۔۔۔۔ایک بڑھیا کا سنسنی خیز قتل'' ۵۰

افسانہ ''سانکل لگا دو'' کا کردار جب دینو سے اپنے ادھار کے پیسے لینے کے لیے جاتا ہے۔تو وہ اپنی

بیوی کے پاس سے لانے کو کہتا ہے افسانے کا اختتامیہ حصہ اس طرح سے ہے کہ:

''چونکہ میں اجالے سے کمرے میں گیا تھا پہلے تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا کچھ لمحے بعد جب آنکھ ملگجے اندھیرے عادی ہوئیں تو میری نظر ایک جوان العمر عورت پر پڑی جو کچھ سینے پرونے میں مصروف تھی مجھے بے دھڑک کمرے میں گھستے دیکھ کر وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی اور حیرت سے تکنے لگی۔ اس کا سراپا دیکھ کر میں اس کی خوبصورتی کا قائل ہوگیا۔ میں نے انتہائی مہذب انداز میں کہا۔

''دینو بھائی کہہ رہے ہیں کہ میں آپ سے سو روپیہ لے لوں'' اچھا اس نے شرما کر نگاہیں جھکالیں اور پھر دھیمے سے بولی اگر ایسا کہہ رہے ہیں تو بھیتر سے سانکل لگا دو۔''۵۱

مختار ٹونکی چونکہ طنز و مزاح کے مہارتی ہیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں سماج میں پھیلی ہوئی بے راہ روی اور کج روی پر طنز نظر آتا ہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی مزاحیہ تحریروں سے وہ اس کے مضحک پہلو کو بھی بیان کرتے ہیں۔ افسانہ ''شاخسانہ'' میں انھوں نے اچھو کی ذہنی کیفیت کو اس طرح سے مضحک انداز میں پیش کیا ہے:۔

''یہ ملک الموت بھی بڑا ہی ستم ظریف ہے جب لوگوں کی روح قبض کرنے آتا ہے تو وقت بے وقت درجنوں کو اپنا شکار کر بیٹھتا ہے اور ہفتوں اسی سلسلے کو جاری رکھتا ہے۔ بعض دفعہ تو اسے راتوں کو بھی قبریں کھودنی پڑی ہیں اور اب دیکھو پندرہ دن سے لا پتا ہے نہ جانے کہاں ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ یہاں کسی کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ ۵۲

مختار ٹونکی کے افسانوں سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ ہمارے روزمراہ کی زندگی سے موضوعات اخذ کرتے ہیں۔ ان کے کردار ہمیں جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ مکالموں میں سادہ بیانی ہے تو پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کے فن کا دائرہ تکمیل کی صورت میں نمایاں نظر آتا ہے۔

﴿ مختار ٹونکی بہ حیثیت خاکہ نگار ﴾

خاکہ نگاری ایک ایسا فن ہے۔ جس میں ایک مکمل شخصیت اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اردو ادب میں بھی ادیبوں، شاعروں اور اپنے قریبیوں کے خاکے دیکھنے کو ملتے ہیں خاکہ نگار کسی شخص کے خاکے کو اس طرح بیان کرے کہ اس کو کسی بھی طرح سے ناگوار نہ لگے۔ ڈاکٹر صابرہ سعیدی خاکہ نگاری کے فن کا اس طرح سے اظہار کرتی ہیں کہ:

''ایک خاکہ نگار انداز ابیان ایسا اختیار کرتا ہے۔ جس کے ذریعہ کسی شخص کا ہلکا سا تعارف یا لمحہ بھر کی زیارت کا نقش قاری کے دل و دماغ پر ثبت کر دے۔ وہ مصائب بھی اس طرح بیان کر جاتا ہے کہ شخصیت کے برے پہلوؤں کے باوجود دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔'' ۵۳

مختار ٹونکی نے خاکے کے فن میں اپنی مہارت دکھائی ہے۔ مگر انھوں نے کم ہی خاکے لکھے ہیں۔ اپنے پہلے مجموعے'' اوٹ پٹانگ''، میں انھوں نے اپنے ایک دوست کا خاکہ لکھا تھا مگر اس مزاح کو نہ سمجھ سکے اور ان سے ناراض ہو گئے۔ مختار صاحب نے اس کا نام بدل کر اپنے مجموعے میں پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مجموعے میں'' گل پوشی خزاں رسیدہ گلزار کی'' کے عنوان پر شگفتہ انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ ان کے ایک خاکہ کا اقتباس درج ذیل ہے:

''یہ جغرافیہ کی بات بھی آپ نے خوب کہی۔ کسی زمانے میں ان کے حلیہ شریف پر جغرافیہ کی اصطلاح فٹ بیٹھی ہوگی۔ اب تو وہ جغرافیہ اور آثار قدیمہ میں گڈ مڈ ہو کر رہ گئے ہیں دیکھو تو زمانے کے سرد و گرم چشیدہ اور گرگ باراں دیدہ نظر آتے ہیں۔ قریب جاؤ تو تقریباً مردم بیزار اور خزاں رسیدہ بہار معلوم ہوتے ہیں۔ نہ عوج بن عوق طرح لمبے تڑنگے اور نہ ازمنہ قدیم کے بونوں کی طرح کوتاہ جسم اور پستہ قد گورے چٹے بھی نہیں کہ جو دیکھے فریفتہ ہو جائے اور اتنے کالے کلوٹے بھی نہیں کہ افریقہ کے حبشیوں کی یاد

یاد آئے۔ سانولے سلونے گل محمد کے بیٹے گلزار احمد خان کامن ناؤن کی طرح سے

بس ایک واجبی واجبی سے انسان ہیں۔۵۴؎

اسی طرح سے انھوں نے ایک مضمون 'خرافات' میں ''مولانا راکٹ'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ جس میں خاکہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اشارے کنائے میں انھوں نے کسی شخص کے اوصاف مولانا راکٹ کے نام سے تحریر کیے ہیں:۔

''مولانا راکٹ ویسے تو واقعی مولانا ہیں۔ فارغ التحصیل، سند یافتہ، شرعی پجامہ ہولڈر اور باقاعدہ ڈاڑھی دار، امور شرعی اور مذہبی مسائل سے خبر دار پہلی بار اگر کوئی ان سے مشرف بہ دیدار ہو تو کہہ نہیں سکتا کہ وہ کوئی مضحکہ خیز قسم کی چیز ہیں۔ بس ہر کام میں ان کی چیتے جیسی چستی پھرتی آدمی کو چونکاتی ہے وہ اتنی تیزی سے اٹھک بیٹھک اور چلت پھرت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ کوئی کٹھ پتلی کسی کی انگلیوں کے اشارے پر ناچ رہی ہے۔''۵۵؎

مختارؔ ٹونکی بے حد سلیقے اور ہنر مندی سے اپنے استاد سید منظور الحسنؔ برکاتی کی شخصیت کا نمایاں کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد کا خاکہ بڑی ہی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ منظور الحسنؔ برکاتی کا خاکہ مونو گراف کی شکل میں ہے۔ جو ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ جس میں ان کی سوانحی کوائف کے ساتھ ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

خدائے سخن میر تقی میر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے　　　اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

میرؔ کا یہ شعر منظور الحسنؔ کی شخصیت اور سیرت کی پوری غمازی کرتا ہے۔ نوجوانی میں وہ اپنی خوش پیکری اور خوش لباسی کی لحاظ سے ایک جوان رعنا تھے۔ زندگی کی اڑسٹھ (۶۸) بہاریں دیکھنے کے بعد بھی وہ خوش شکل اور خوش وضع دکھائی دیتے تھے۔ بلا شبہ وہ ایک چاہے جانے والی شخصیت کے مالک تھے۔ اسی کے ساتھ وہ رواداری، وضع داری اور منکسر المزاجی کے ایک مثالی نمونہ تھے اور شرافت و نجابت اور تہذیب و شائستگی کا

خوش نما پیکر تھے۔ وہ محبت کرنے والی اور دل لبھانے والی ادائیں رکھتے تھے۔مزاج کی نفاست اور طبیعت کی شرافت دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ''فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا۔'' ۵۶

مختار ٹونکی کی تحقیق اور تنقید نگاری

تحقیق :۔تحقیق تلاش،غور وفکر اور جستجو کا عمل ہے۔جس میں اصلیت کی دریافت اور کسی بات کی توثیق کرنا اور اس میں حقائق تفتیش اور تجزیہ کے بعد نتائج کو اخذ کرنا ہوتا ہے۔مختلف لوگوں نے تحقیق کی تعریف اس طرح کی ہے۔ مالک رام کے مطابق:

''تحقیق کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے علم وادب میں کھرے کو کھوٹے سے مغز کو چھلکے سے،حق کو باطل سے الگ کریں۔'' ۵۷

ادب میں تحقیق نہ صرف حقیقت کو واضح کرتی ہے بلکہ وہ صحیح اور غلط پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔محقیق اپنی تحقیق سے نامعلوم سے معلوم کی طرف گامزن ہوتی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین تحقیق کی تعریف اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ:

''ریسرچ ایک حقیقت پنہاں یا حقیقت مبہم کو افشاں کرنے کا باضابطہ عمل ہے۔
اور اسی تعریف سے تحقیق کا مقصد بھی صاف ہو جاتا ہے۔'نامعلوم یا کم معلوم کو جاننا یعنی جو حقائق ہمارے نظروں کے سامنے نہیں ہیں انہیں کھوجنا' جو سامنے تو ہیں لیکن دھندلے ہیں ان کی دھند کو دور کر کے ان کا آئینہ کر دینا۔'' ۵۸

علم وادب میں تحقیق کے مقصد پر ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش نے اس طرح اپنے خیال کا اظہار کیا ہے:۔

''تحقیق کی بنیاد تلاش وجستجو،مشاہدات،تجربات اور علوم کے افہام وتفہیم پر ہوتی ہے۔تحقیق ایک محتاط سرگرم جستجو اور مسلسل کاوش اظہار ہے۔جس میں مروجہ حقیقتوں کی تصدیق نئی حقیقتوں کی تلاش اور سچائی کی کھوج میں مضمر ہے۔ ۵۹

اس طرح تحقیق ایک ایسا عمل ہے۔جس کا مقصد حقائق کی شناخت کرنا ہے۔تحقیق بنیادی طور پر ان

موضوعات کے نتائج کو اخذ کرتی ہے جو کہ مخفی اور پوشیدہ ہوں اور ان کو کسی صورت اجاگر کیا جائے۔

تنقید :۔ کھرے کھوٹے اور غلط صحیح میں فرق کرنا ہی تنقید ہے۔ اچھے اور برے میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہر شخص میں موجود ہوتی ہے۔ ٹی، ایس ایلیٹ نے تنقید کو زندگی کے لیے اتنا ہی اہم بتایا ہے جتنا کہ سانس۔ یعنی تنقید زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتی ہے۔ میتھیو آرنلڈ کے مطابق:

''دنیا میں جو بہترین باتیں معلوم ہیں یا سوچی گئی ہیں انہیں غیر جانب دارانہ طور پر جاننے اور عام کرنے کی خواہش کا نام تنقید ہے۔''۶۰

ڈاکٹر عبارت بریلوی تنقید کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

''تنقید زندگی سے براہ راست تعلق رکھتی ہے۔ وہ زندگی کو سمجھنے اور اس کے مختلف مظاہر کے جاننے کا ایک ذریعہ ہے''۶۱

جس طرح تنقید زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی ہر شعبے میں تنقید کا گہرا رشتہ ہے۔ ادب اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ آپس میں اتنی مماثلت رکھتے ہیں کہ ان کو الگ کرنا ناممکن ہے یعنی تخلیق کے ساتھ ہی تنقید بھی ضروری ہے۔

جب کسی فن کار کے ذہن میں کوئی تخلیق ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں تنقیدی عمل بھی وجود میں آجاتا ہے اور اسی تنقیدی عمل کے ساتھ تحقیق کے عمل کا بھی آغاز ہو جاتا ہے۔ ایلیٹ نے اپنے مضمون The Function of criticism(1923) میں تحقیق اور تنقید کے رشتے پر اظہار خیال یوں کیا ہے:۔

''شاید درحقیقت ایک مصنف کی اپنی تصنیف کے سلسلے میں محنت شاقہ کا بڑا حصہ تنقیدی محنت کا ہوتا ہے یعنی چھانٹنے، جوڑنے، تعمیر کرنے، خارج کرنے، صحیح کرنے، جانچنے کی محنت یہ اذیت ناک محنت جتنی تنقیدی ہوتی ہے اتنی ہی تخلیقی ہوتی ہے''۶۲

تبصرہ نگاری :۔

ادب میں تنقید کے ساتھ ہی تبصرے کی بھی روایت رہی ہے۔تبصرہ عربی لفظ ''بصر'' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں دیکھنا اور لفظی اعتبار سے کوئی چیز دکھانا۔اس کے علاوہ تبصرے کی تعریف یوں بھی بیان کی جاسکتی ہے کہ کسی تحریر یا بات پر اظہار خیال کرنا۔

اردو ادب میں تنقید و تحقیق کے ساتھ ہی تبصرے کی بھی روایت ہے۔ جو حرف اول، مقدمہ، پیش لفظ، کتاب پر تبصرہ و تجزیہ وغیرہ کے نام سے لکھے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں پروفیسر گیان چند جین کہتے ہیں کہ:

''تبصرہ تنقید کی وہ شاخ ہے جو کسی کتاب یا مختصر تخلیق کے بارے میں کی جاتی ہے۔'' ۶۳

پروفیسر یوسف سرمست نے تبصرہ نگاری کے متعلق کہا ہے کہ:

''تبصرے کا کام بینا کرنا یعنی کسی چیز کو دیکھنا اور اس کا جائزہ لینا ہے۔تبصرہ نگار کا کام صرف دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے گویا تبصرہ کا کام متعارف کرنے کا دوسرا نام ہے۔'' ۶۴

مختار ٹونکی ایک شاعر، افسانہ نگار، طنز و مزاح نگار ہی نہیں ہیں بلکہ وہ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں اپنا ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔بطور محقق ان کی شہرت کا اندازہ ان کی تصنیف ''فکر پارہ پارہ'' کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔جس میں مختلف النوع مضامین شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان کی تحقیقی اور تنقیدی تصانیف 'اختر شیرانی تلاش و تجزیہ'، 'یادگار بصر ٹونکی'، 'فراز حامدی کی دوہا نگاری حصہ اول و دوم'، قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی نے اپنے تبصرے مختار ٹونکی اور فکر پارہ پارہ میں ان کی تحقیق اور تبصرے کی خصوصیات اس طرح سے بیان کی ہیں کہ:

''مختار ٹونکی تحقیقی مضامین لکھی کہ تنقیدی یا پھر کسی اور نوعیت کے مضامین لکھیں ان کے اسلوب کا جادو ہر جگہ قائم رہتا ہے اور وہ بے ساختہ قسم کے جملے جو مختار ٹونکی کے اسلوب کی شناخت سمجھے جاتے ہیں قارئین کو یکسر سرشار کر دیتے ہیں اور وہ

ایک خاص طرح کی لگاوٹ کے ساتھ تو مختار ٹونکی کی کتاب پڑھ جاتے ہیں''۶۵

تحقیق پر مختار ٹونکی اپنی کتاب ''فکر پارہ پارہ'' میں اپنے مضمون اردو تحقیق پر ایک نظر کے تحت اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ:

''میری نظر میں تحقیق کا کام نہایت اہم اور بہت دشوار ہے اور اس پر نہایت دانش مندی سے کام ہونا چاہیئے۔''۶۶

موصوف تحقیق میں دانش مندانہ رویہ اختیار کرنے کی اصلاح دے رہے ہیں کیونکہ وہ موجودہ دور میں تحقیق میں ناعاقبت اندیشی و بےفکری کے تعلق سے فکرمند ہیں ان کا خیال ہے کہ:

''تحقیقی کارنامے صحت اور جامعیت کے اعتبار سے قطعی طور پر تحقیق کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ جب جادہ تحقیق پر گامزن ایک تحقیق کنندہ تحقیقی مسائل کے ادراک سے بے بہرہ ہوگا تحقیق کی سنگلاخ گھاٹیوں کو طے کرنے کا عزم وحوصلہ نہ رکھتا ہوگا اور تلاش وتفحص کے پر خطر مراحل سے وہ گریز کرے گا تو فائز منزل کیسے ہوسکتا ہے۔ ۶۷

یہاں اس بات سے قطع نظر کہ تحقیق کی کیا مسائل اور دشواریاں ہیں۔ مطمح نظر یہ ہے کہ مختار ٹونکی کی تحقیقی کاوشات کا جائزہ لیا جائے۔ ان کی فکر، نظریہ اور انداز بیان پر گفتگو کی جائے اور عمل تحقیق میں ان کا مقام متعین کیا جائے۔

مطالعہ اختر شیرانی (تلاش وتجزیہ):۔

شاعر شباب، شاعر رومان اور شاعر حسن اختر شیرانی اردو ادب میں اعلیٰ اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق ریاست ٹونک سے رہا ہے۔ وہ یہیں پر پیدا ہوئے اور مروجہ تعلیم کے حصول کے بعد اپنے اس فن شاعری کی آبیاری اسی سرزمین ٹونک میں کی اور اس کو پروان چڑھایا۔ ان کے والد محترم مشہور محقق حافظ محمود شیرانیؔ نے ان کی تعلیم وتربیت میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ رکھی تھی۔

۲۰۱۲ء میں مختار ٹونکی کی مرتب تصنیف ''مطالعہ اختر شیرانی تلاش و تجزیہ'' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی جانب سے شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے اس تصنیف میں اختر شیرانی کی شاعری پر مضامین قلم بند کئے ہیں۔ موصوف نے جامعیت اور اختصار کے ساتھ اختر شیرانی کی نثری و شعری خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ ابتداء میں انھوں نے اختر شیرانی کے مختصر احوال کو کوائف، شجرۂ نسب اور قلمی آثار کو پیش کیا ہے۔ ان کا شجرۂ نسب چاند خاں شیرانی، اسماعیل خان، محمود خان اور داؤد خان تک پہنچتا ہے۔

مختار ٹونکی نے اپنے اس مضمون میں اختر شیرانی کی جنت ارضی میں، ۔ زبان و بیان کی دلکشی کے ساتھ سرزمین ٹونک کی سیر کرائی ہے۔ جہاں پر اختر شیرانی اپنی شعری جولانیوں کو جلا بخشتے تھے اور اپنے شوق و ذوق کی تسکین کیا کرتے تھے۔ اس مضمون میں انھوں نے اختر کے چچا زاد بھائی حکیم عبد العلیم کاشت کار سے ملاقات کا بھی بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کے حالات، واقعات، شاعری اور شکار کا بیان کیا ہے۔ وہ اختر شیرانی کی خوبیوں کا بیان ان کے بھائی کی زبانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''آپ خود اندازہ لگائیں کہ وہ ایک طرف بہترین شکاری تھا اور بندوق کا
ماہر نشانہ باز تھا تو دوسری طرف اسی ہاتھ سے وہ قلم کے ذریعہ کاغذ پر پھول
بکھیر سکتا تھا آپ کو معلوم نہ ہو وہ کشتی اور پہلوانی کے فن سے بھی واقف تھا
اور لکڑی چلانے کے داؤ پیچ بھی وہ اچھی طرح جانتا تھا۔'' ۶۸

اختر شیرانی کی زندگی ایک المیہ ہی رہی چاہے وہ دوران حیات ہو یا پھر بعد از حیات ہو۔ ان کے بارے میں افواہوں کا بازار ہمیشہ ہی گرم رہا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے درمیان جب وہ ٹونک ہی میں مقیم تھے تو چاروں طرف ان کی موت کی افواہ پھیل گئی۔ اس سلسلے میں ایک مثال کا بیان ہوتا ہے۔ جس کو ڈاکٹر داؤد رہبر ولد پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے اپنے خطوط کے مجموعے ''سلام و پیام'' میں لکھا ہے:۔

''لاش شہر میں کسی سڑک پر پائی گئی تھی۔ پولیس نے تانگے میں رکھ کر مردہ خانے
پہنچائی تھی انا ٹومی کے بڑے پروفیسر ڈاکٹر فخر الدین مرحوم تھے۔ بھائی صاحب

(ڈاکٹر رہبر کے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد اسحاق) ان کے ماتحت تھے۔ بھائی صاحب نے ان کو آگاہ کیا اور کہا کہ غضب ہے ایسا نامی آدمی گمنام ہو کر یہاں پہنچا۔ اختر کے عزیزوں کو فوراً خبر کی جائے کہ آکر جنازہ کا انتظام کریں۔ ڈاکٹر فخر الدین نے فرمایا۔ اجی یہ شرابی تھا۔ اس کی لاش کیمیائی جائے اور علم الابدان میں چیڑ پھاڑ کے لیے استعمال کی جائے۔ ایسوں کا یہی انجام ہونا چاہیئے۔ ۶۹

ان کی موت پر کئی افسانے بنائے گئے جو ان کی وفات کے بعد بھی قائم رہے۔ مثلاً اختر شیرانی نے خود کشی کی تھی۔ لیکن دراصل یہ شورش کاشمیری کا مضمون تھا جس میں انھوں نے اس طرح الفاظ میں باندھا تھا کہ ''لوگ کہتے ہیں کہ اختر مر گیا میں کہتا ہوں کہ اختر نے خودکشی کی تھی'' یہ جملہ ان کی شراب نوشی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اصل میں ان کی موت ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میوا سپتال میں ہوئی۔ اس وقت ان کے پاس خاندان کا کوئی بھی فرد موجود نہ تھا سوائے ان کے دوست حکیم نیر واسطی اور ان کے بھانجے سید ذہانت حسین کے۔

کسوف اختر :۔ معروف تاریخ گو شاعر منشی عبدالبصیر بصر نے ایک نوحہ نما نظم کسوف اختر کا ذکر کیا ہے جس کے ہر مصرعے میں مختلف سن وفات برآمد ہوتے ہیں۔ مثلا یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بہ نثر و ادب وہ متین یگانہ	سخن میں موافق وہ طرز زمانہ
۱۳۶۷ھ	۱۳۶۷ھ
بہ فکر و بیاں دلکش شاعرانہ	بہ ہر حال زیبا سخن فاضلانہ
۱۳۶۷ھ	۱۹۴۸ء

اس تصنیف کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ اس میں موصوف نے ''سلمٰی کی حقیقت'' کے عنوان سے اختر شیرانی کی محبوبہ ان کی شاعری کی روح کائنات سلمیٰ پر روشنی ڈالی ہے۔

کچھ لوگ سلمیٰ کو ان کا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ تو کچھ سرمست خیال تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ان کے کچھ خاص

احباب ہی اس سے واقف ہیں۔حکیم نیر واسطی ان کے خاص دوست تھے۔جنھوں نے 'سلمیٰ اور اختر' کے نام سے ان کے خطوط جمع اور شائع کئے تھے۔ان کے بھیجنے کی دریافت میں خود اختر شیرانی نے اعتراف کیا ہی کہ:

اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو میں تفصیل سے تم کو سب کچھ بتاؤں گا۔یہ حقیقت ہے کہ سلمیٰ ایک مجسم حسن اور رعنائی کا پیکر ہیں۔وہ بہت باذوق ہیں اور ادبی وشعری فہم کی مالک ہیں۔ان کا اصل نام سلمیٰ نہیں ہے اور اصل نام میں تم کو بتاؤں گا بھی نہیں کیونکہ یہ میرے جذبۂ عشق کے وقار کی توہین ہے کہ میں ان کا نام سر عام لیتا پھروں۔وہ گجرات کی رہنے والی ہیں۔میں نے انھیں سلمیٰ کا نام اس لیے دیا ہے کہ حافظ شیرازی کے اس شعر میں مجھے سلمیٰ ہمیشہ سے پسند ہے۔ (سلمیٰ منذ حلت بالعراق الاتی فی ہواما الاقی۔ص ۹۶۔۷۷)

اس کے علاوہ اختر شیرانی کی نظم کا تجزیہ ''اختر شیرانی کے آخری ایام''،''رندخانہ شراب کی باتیں'' ''متعلقات اختر''،''نذر اختر'' ان کے کارنامے،ظریفانہ کیفیت کے ساتھ زندگی کے مختلف احوال کے ذکر کے ساتھ ان کے تلامذہ کا بھی ذکر ہے۔جنھوں نے ان سے استفادہ کیا تھا۔

موصوف کی یہ کتاب ان کے تحقیقی ذوق کی نشان دہی کرتی ہے۔صحیح تو یہ ہے کہ انھوں نے اختر شیرانی پر جملہ معلومات فراہم کر دی ہیں اور ہر طرح سے ان کے فن اور شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ان کا یہ کارنامہ بھی ایک یادگار رہے گا۔

یادگار بصرٹونکی:۔

یادگار بصرٹونکی کو مختار ٹونکی نے مرتب کیا ہے۔یہ کتاب راجستھان اردو اکادمی کے مالی تعاون سے ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں مختار ٹونکی نے ٹونک کے مشہور شاعر بصر ٹونکی کے شعری کلام اور ان کی ادبی خدمات کو پیش کیا ہے۔'یادگار بصرٹونکی' کی تدوین ان کا اہم کارنامہ ہے۔یہ تصنیف اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ بصر ٹونکی مختار ٹونکی کے استاد ہیں۔اس کتاب کو ترتیب دے کر انھوں نے حق شاگردی ادا کرتے ہوئے اپنے استاد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

بصر ٹونکی ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے کارنامے بھی کسی ادارے سے کم نہیں ہیں لیکن ان

کو موجودہ دور میں فراموش کر دیا گیا ہے وہ اپنے عہد کے ایک قد آور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک تاریخ گو کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے ان کی اسی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے مختار ٹونکی کہتے ہیں کہ:

''عبدالبصیر بصر ٹونکی بھی اپنے عہد کی ایک ایسی ہی یکتائے روزگار شخصیت کے حامل تھے جنہوں نے شعر و ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا اور اپنی پوری زندگی کو تدریس سخن میں کھپا رکھا تھا۔ اہل ٹونک پر تو ان کی خدمات جلیلہ اظہر من الشمس ہیں۔ سینکڑوں سنگریزیوں کو انھوں نے تراش خراش کر کوہ نور کے ہم پلہ بنایا اور پچاسوں ذرہ ہائے بے مقدار کو درشہوار کا درجہ دلوایا۔ واضع باد کی استاذ الشعراء بصر ٹونکی اپنی ذات میں بہت کچھ تھے اور انھوں نے ادب کو بہت کچھ دیا ہے شہرت سے بے نیازی اور جاہ مرتبت کی بے طلبی کی وجہ سے وہ ہندوستان گیر پیمانے پر متعارف نہیں ہو سکے ورنہ وہ ایک انجمن کی حیثیت رکھتے تھے انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ کسی ادارے کے کارناموں سے کم نہیں تھے۔ فی الحقیقت ''وہ ایک فرد تھے انجمن کے برابر'' ۷۰

انھوں نے کئی انجمنوں کی بنیاد بھی ڈالی اور شعری نشستیں بھی کروائیں۔ تاریخ گوئی بصر کو وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد عبید اللہ بصیر اپنے وقت کے تاریخ گو تھے۔ ان کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ وہ نابینا ہونے کے باوجود تاریخ نکالتے تھے۔ ان کی تین پیڑھیاں تاریخ گوئی کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ یعنی بصیر صاحب کے بعد بصر صاحب اور اب ان کے بعد ان کی بیٹی تاریخ گوئی کا ملکہ رکھتی ہیں۔

اس کتاب میں مختار صاحب نے بصر ٹونکی کی نعوت، غزل، نظم، چار بیت کے ساتھ تاریخ پر مبنی کلام کو یکجا کر کے جائزہ لیا ہے۔ لیکن ان کے کلام کی دستیابی دقت طلب مرحلہ رہی۔ اس سلسلے میں کچھ کلام تو مختار صاحب نے اپنی کوششوں سے حاصل کیا اس کے ساتھ ہی انھوں نے ان کی فرزند ارجمند زبید احمد صاحب ایڈو کیٹ سے بہ مشکل تلاش و جستجو کے ایک بیاض حاصل کی۔ اس کے علاوہ مزید تلاش کے بعد جو بھی کلام ان کو

حاصل ہو سکا اس کو انھوں نے کتابی شکل میں شائع کیا اور اپنی اس کوشش سے انھوں نے آنے والی نسل کو بصر ٹونکی سے واقف کرایا ہے۔

مختار صاحب نے بصر صاحب کے متعلق جو بھی معلومات فراہم کرائی ہیں۔ وہ قابل تحسین ہیں۔اس پر انھوں نے اپنے تاثرات کا بھی اظہار کیا ہے۔انھوں نے اپنی تمام ہی تصانیف میں ایک قلم کار کی حیثیت سے دیانت دارانہ فرائض انجام دیے ہیں۔

فکر پارہ پارہ :۔

فکر پارہ پارہ مختار ٹونکی کی مختلف اقسام کے مضامین کا مجموعہ ہے جس کو اسم بامسمیٰ کہا جا سکتا ہے یہ مجموعہ ۲۰۱۵ء میں منظر عام پر آیا تھا۔اس میں کل ۴۷ مضامین ہیں جو کہ ان کی فکر وفن کی پختگی اور بالغ النظری کا ثبوت ہیں۔ان کے مطالعے سے ان کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔نثر جب عملی طور پر برتی جائے تو موضوع کی منزلت اور وقعت کے اعتبار سے آراستگی اور زیب و زینت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اور ہر فن کار کا عکس اسی میں ظاہر ہوتا ہے اور یہی چیز نثر میں انفرادیت بخشتی ہے۔مختار صاحب کی اس کتاب میں یہی انفرادیت نظر آتی ہے۔

اس کتاب کی ابتدا شاداب ذکی کے حمدیہ کلام سے ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ نعت گوئی ایک ایسا فن ہے جیسا کی تلوار کی دھار پر چلنا اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو کہ پاکیزہ جذبات اور احساسات سے سرشار ہو وہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔اس میدان میں مسلم شعراء ہی نہیں بلکہ غیر مسلم شعرا بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے اپنے مضمون ''راجستھان کے ہندو نعت گو شعرا'' میں راجستھان کے نعت گو شعرا منشی چاند بہاری لال صبا، منشی چھمی نرائن سخا، پنڈت شیو ناتھ کیف، پرکاش نرائن جوہری منشی دوارکا پرساد عنبر، پنڈت رام نواس ندیم، سیٹھ اتم چند چندن اور تربھون شنکر عارف کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔

بقول مختار ٹونکی:

''راجستھان کے ہندو نعت گو شعرا نے محبوب کبریا کو اپنا حبیب و عزیز بنایا اور

اپنے عقیدت بھرے جذبات وخیالات کو مقدس الفاظ کے قالب میں ڈھال
کر جو سرمایہ سخن لٹایا وہ لائق تحسین وتبریک ہی نہیں بلکہ قابل صدتوقیر وتعظیم ہے'' اے

تاریخ گوئی جو کہ ایک مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔جس کا برتنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔اردو میں بھی کئی شعرا نے اپنے کمال فن کا مظاہر کیا ہے۔مختار ٹونکی نے اس میں ''مبادیات فن تاریخ گوئی'' میں تاریخ کی فنی لوازمات کا بیان کیا ہے۔اسی کے ساتھ انھوں مومن کی تاریخ کی خصوصیات کو بھی بیان کیا ہے۔نیز انھوں نے مومن کے علم نجوم پر بھی ایک مضمون ''مومن اور علم نجوم'' کے عنوان سے لکھا ہے۔جس میں انھوں نے مومن کے علم نجوم کی عظمت کو بیان کیا ہے۔مومن نے اپنی تاریخ وفات خود نکالی تھی اور وفات کی تاریخ پانچ دن، پانچ مہینے اور پانچ سال بتائی تھی اور پانچ ماہ بعد ہی ان کی وفات ہوئی۔

مختار ٹونکی نے فن تاریخ گوئی اور علم نجوم پر مضامین سپرد قلم کر کے اس کی طرف توجہ مرکوز کرائی ہے کیونکہ موجودہ دور میں یہ فن زوال پذیر ہے۔

اسی طرح سے انھوں نے اس تصنیف میں طوائف جیسے اہم موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے۔طوائف کا پیشہ جو کہ سماج میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے مگر قدیم زمانے میں رسوخ دار لوگ اپنی اولادوں کی تربیت، گفتگو کے آداب،نشست وبرخاست کے طریقے سکھانے کے لیے طوائفوں کے کوٹھے پر بھیجتے تھے۔

مختار صاحب نے اپنے مضمون ''طوائفوں کے اردو کوائف'' میں اسی موضوع کے تحت طوائفوں کی اردو شعروادب کی خدمات پر قلم اٹھایا ہے اور ان کی جانب سے ادب میں کئے گئے اضافے کا خلاصہ کیا گیا ہے۔وہ اپنے اس مضمون میں اس طرح رقم طراز ہیں کہ:

''ہمیں تو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ نام نہاد مؤرخوں نے طوائفوں کو بالکل نظرانداز وپس انداز کر دیا ہے۔جب کہ ان کی خدمات عیاں راچہ بیاں کی حیثیت رکھتی ہیں اردو شعروادب کی خدمات کیا،طوائفوں نے تو ہمیشہ متمدن سماج اور ہمارے مہذب معاشرے کی بہترین خدمات کے لیے اپنا دل دریا اور

سمندر بنائے رکھا ہے اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو اپنے حسن و جمال اور فن کمال سے مستفید و مستفیض فرمایا ہے ۔مگر ہائے زمانہ وائے زمانہ کہ اس نے انھیں کھلونوں کی دوکان اور تفریح کا سامان سمجھا'' ۲ے

موصوف نے اپنے مضمون میں ان طوائف شعرا کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ نامور شاعروں سے وابستہ تھیں اور کئی سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لیا کرتی تھیں ۔ واقعہ یہ ہے طوائفوں نے بھی اپنی ادبی خدمات سے اردو شعر وسخن کو کافی فائدہ پہنچایا ہے ۔اس سلسلے میں انھوں نے مشہور شاعروں کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ

آتش اور ناسخ ایک بار ایک طویل القامت طوائف کے دربار میں پہنچ گئے اس کی درازیٔ قامت پر آتش کی جو شامت آئی تو بے ختیار کہہ اٹھے کہ ''طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے'' شاعر صاحب نے تو پھبتی کسی تھی اور طوائف کو تو اشارہ کافی تھا فوراً ٹھٹھک گئی ۔مگر واہ رے ! ناسخ فوراً یہ مصرعہ جڑ دیا اور موقع کی نزاکت کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کر دیا کہ:

یہ زلف مسلسل جوترے کاندھے پر پڑی ہے طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے

اس انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختار صاحب نے اپنے تحقیقی فن میں اپنے مخصوص انداز کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور قاری کو اپنے انداز بیان سے لطف اندوز کیا ہے ۔

موصوف نے اپنی تحقیقی گراں قدر کتاب میں جہاں ایک طرف مشہور اصناف دو ہے ، گیت ، غزل ، افسانہ ، ماہیہ ، ادب اطفال ، انشائیہ ، ڈرامہ ، رباعی ، ہائیکو وغیرہ کے متعلق مختلف اور منفرد مضامین لکھے ہیں ۔ وہی دوسری طرف انھوں نے مائل بہ زوال اصناف کی طرف بھی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے ۔ کیونکہ موجودہ دور میں شعرا ان ہی اصناف پر زیادہ توجہ کرتے ہیں جو کہ بام عروج پر ہوں ۔جس کے نتیجے میں متعدد اصناف ایسی ہیں جن پر کسی طرح سے توجہ نہیں دی جاتی ہے ۔مختار صاحب نے ایسی ہی ایک صنف پر اپنا مضمون سپرد قلم کیا ہے اور وہ صنف ہے ''سہرا'' ۔موصوف نے سہرے کی روایت پر مضمون لکھ کر اس کی تاریخ پر روشنی

ڈالی ہے۔سہرا اردو شاعری میں رائج ہے۔جس پر کئی نامور شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ مگر آج اس کو ایک صنف کے طور پر قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ان کے نزدیک سہرا ہندی زبان کا لفظ ہے اور یہ صنف ہندوستان ہی میں رائج ہوئی ہے۔عربی و فارسی سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ہندی میں اس کے معنی ہیں'' پھولوں کی لڑیاں'' جو کہ دولہا اور دلہن کے سر پر لٹکائی جاتی ہیں۔شبلی بی کام کے مطابق:

''ہندوؤں میں سہرا باندھنے کی رسم سورج بنسی خاندان کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔'' ۳؎

ہندوؤں میں بھاٹ ذات کے لوگ اپنی روزی روٹی کے لئے شادی بیاہ میں پیغام لے کر لڑکے اور لڑکی کے گھر جاتے ہیں اور دولہے کی مدح میں سہرا بیان کرتے تھے۔

اردو میں غالب نے سب سے پہلے اس کو لکھا بہادر شاہ ظفر کی بیگم کے فرزند ارجمند مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر جس کا مطلع تھا کہ:

خوش ہوائے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا　　باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

مختار صاحب سہرے پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ:

''سہرا مختلف ادوار میں شاعری کا ایک اہم عنصر رہا ہے اور غالب، ذوق جیسے استاد ان سخن نے اسے منھ لگا کر سرخروئی بخشی ہے۔مگر اہل ذوق نے اس کو محض تفنن طبع کا ہی ذریعہ سمجھا اور نقادان سخن نے اس صنف شاعری پر کوئی خصوصی توجہ نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ سہرے نہ تو شعرائے کرام کے دواوین میں نظر آئے ہیں اور نہ ان کا کوئی مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ضرورت ہے اردو کے ریسرچ اسکالرس اس کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں۔تلاش و تفتیش پر سہروں کے اشعار کے معتد بہ حصہ دستیاب ہوسکتا ہے۔'' ۴؎

غرض یہ فکر پارہ پارہ میں مختلف نوعیت کے درجنوں مضامین موجود ہیں جو کہ ہر اعتبار سے ان کے مطالعے کی وسعت اور ان کی فکر بالیدگی کو ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ مضامین پہلے مختلف

رسائل جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ایک کتاب ''فانوس فکر'' کے نام سے بھی زیر اشاعت ہے۔جس میں تقریباً پچاس مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔

فراز حامدی کی دوہا نگاری : (ارباب قلم کی نظر میں۔حصہ اول) :۔

دوہا ہندوستان کی ادبی تہذیب اور وراثت کی پہچان ہے،دوہا نگاری نے اپنی فنی خصوصیات اور کلاسیکی انداز سے اردو ادب میں بھی مقبولیت اور عظمت کو حاصل کیا ہے۔اردو شعرا نے وقتاً فوقتاً اس میں طبع آزمائی کی ہے مگر اس میں فراز حامدی کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔انھوں نے اس صنف کو بام عروج تک پہنچایا ہے۔مختار ٹونکی صاحب نے ان کی دوہا نگاری کے متعلق مختلف قلم کاروں کے مضامین کو جمع کر کے مذکورہ بالا کتاب کو ترتیب دیا ہے جو کہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔

واضح ہو کہ فراز حامدی کو دوہوں سے شروع ہی سے بہت رغبت تھی۔باوجود ناراضگی اور مخالفت کے انھوں نے اس کو ترک نہیں کیا۔ اور دوہا نگاری میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس فن میں کئی تجربات بھی کئے ہیں۔انھوں نے دوہا نگاری کے ساتھ دوہا گیت،دوہا غزل،دوہا حمد،دوہا نعت،دوہا معریٰ نظم،دوہا ترائیلہ،دوہا مثلث،وغیرہ کی شناخت اور دوہے کی ہر صنف کو برتا ہے جو کہ قابل تعریف ہے۔

فراز حامدی کے دوہا نگاری کے ابتدائی دور اور ان کا دوہوں سے لگاؤ کا بیان مختار صاحب نے اپنی کتاب میں اس طرح سے بیان کیا ہے:۔

> ''فراز حامدی صاحب جب دوہا صنف میں اپنے پر پرواز نکالے تو اساتذہ سخن کو بے وقت کی راگنی پسند نہیں آئی۔مشہور تاریخ گو استاذ الشعراء بصر ٹونکی مرحوم نے انہیں سرزنش کی اور ایسی طبع آزمائی کرنے سے باز رہنے کو کہا۔کیف بھوپالی نے بھی جب ٹونک آکر اس طرح دوہے سنے تو اپنی ناراضگی ظاہر کی،عام شعراء اور اساتذہ سے پذیرائی نہ ملنے پر وہ اپنے ہندی کے استاد رام کرن مشرا کے پاس گئے اور انھیں بھی اس قسم کے دوہے سنائے۔لیکن انھوں نے بھی فراز صاحب کی

کاوشات کو دوہا تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ یہ دوہے نہیں ہیں بلکہ ایک طرح سے غزل کے شعر ہیں ان کی دانست میں دوہا کا نفیس غزل کے شعر سے جداگانہ ہوتا ہے۔صرف تیرہ گیارہ ماتراؤں کے استعمال سے دومصرعہ دوہا نہیں بن جاتے ہیں۔مگر فراز صاحب نے حوصلہ مندی سے کام لیا اور برابر اردو دوہا کی شاہراہ پر گامزن رہے اور عشق وممارست سے دوہا نگاری میں نکھار پیدا کرتے رہے۔ ۵؎

دوہا نگاری سے عشق وممارثت نے ان کو دوہا نگاری کا بادشاہ بنادیا۔انھوں نے دوہا نگاری کی ابتداء اس وقت کی جب کہ اس کا چلن کم ہی تھا اور دوہا کی شناخت ان کی شخصیت سے ہے۔

پروفیسر محمد محفوظ الحسن اپنی کتاب ''فراز حامدی کی دوہا نگاری ایک تجزیاتی مطالعہ''؛ میں فراز حامدی کے دوہا نگاری کے تعلق سے غلام مرتضیٰ راہی کے خیال کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

''فراز حامدی کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت، جدت طبع اور ذہن رسا سے ہندی اردو کے دوہا نگاروں پر فکر واسلوب اور ہیئت کی نئی جہات روشن ہوتی ہیں نئے امکانات کے در وا ہوتے ہیں، دوہا کی معنویت وانفرادیت میں زور اور استحکام آیا ہے، دوہا میں فکری دبازت، گہرا معنوی، رنگ، تنوع، عصری حسیت اور اظہار میں تیکھے پن اور نشتریت کو فروغ ملا ہے۔ دماغ کی جودت اور روح کی قوت سے تخلیق کئے گئے فراز حامدی کے دوہوں اور گیتوں سے گمان بھی نہیں گزرتا ہے کہ یہ اصناف شاعری اردو کی نہیں'' ۶؎

فراز حامدی نے اپنے دوہوں میں اسلوب اور ندرت پسندی سے دوہا نگاری کی نئی جہت دی ہے۔ان کا منفرد اور حقیقت پسندانہ انداز ان کی دوہا نگاری کی خوبی کو بڑھاتا ہے۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اپنے مضمون ''ڈاکٹر فراز حامدی بہ حیثیت دوہا نگار'' میں ان کی انفرادیت پر یوں رقم طراز ہیں:

''فراز حامدی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انفرادی ردعمل کی پیش کش پر زور دیتے ہیں۔اور اجتماعی محسوسات کو بروئے کار لاتے ہیں جس سے عصری صداقت ظاہر ہوتی ہے دوہے جیسی قدیم صنف کو نیا رنگ روپ بخشنے میں انہیں یدطولیٰ حاصل ہے۔انھوں نے نئے تلمیحات واشارات اور نئی علامتوں کے ساتھ دوہے کی ہیئت میں بھی تبدیلی کی ہے اور منفرد تخلیقی طبع کا ثبوت دیا ہے اپنے اسلوب فکر اور انداز اظہار کی ندرت سے تخلیقی فضا پیدا کرنے میں انہیں مہارت حاصل ہے'' ۷ے

مختار ٹونکی صاحب نے بھی اپنے مزاحیہ انداز میں فراز حامدی پر ایک مضمون بہ عنوان '' دوہے کا دولہا'' سپرد قلم کیا ہے اس میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

''فراز حامدی کے دوہے اپنے آہنگ سے کانوں میں سنگیت رس گھولتے ہیں۔طرز ادا سے دل کے پردے کھولتے ہیں اور نفس مضمون سے ذہن میں دائمی نقش چھوڑتے ہیں۔بے شک اور لوگوں نے دوہے کی دھوتی کر پھاڑ کو رومال کیا ہوگا مگر ایں جناب نے اس چھند کے وسیلے سے کمال کیا ہے کہ اردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے پھر فراز جدت طراز جو ٹھہرے۔ہئتی تجربات ان کی پرانی ہابی ہے، ذہنی اپج اور فکری اختراع نے یہ کرشمہ دکھایا کہ 'مطلع نما دوہے' کہنے پر اکسایا اور پھر آگے بڑھے تو خود کیا چمتکار دوہوں کو دیا نیا سنسار، فراز حامدی کے ایک دوہا جو دوہے کے اوزان نظاہر کرتا ہے

تیرہ ، گیرہ ماترا ، بیچ بیچ میں وشرام

دو مصرعوں کی شاعری، دوہا جس کا نام ۸ے

فراز حامدی کی اردو دوہا نگاری: (ارباب قلم کی نظر میں۔حصہ دوم):۔

اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے فراز حامدی نے اردو دوہے میں دوسری اصناف کو شامل کر کے اس کو ایک نیا آہنگ عطا کیا اور دوہا نگاری میں وسعت پیدا کی ہے۔ان کی حمد یہ دوہوں کے بارے میں رفیق شاہین

(علی گڈھ) اپنے مضمون بہ عنوان ''مجدد موجد دوہا نگار ڈاکٹر فراز حامدی'' میں یورقم طراز ہیں:

''ان کے حمدیہ دوہے ان کے جذبہ تشکر کے ترجمان ہیں۔ اس کا ازل تا ابد قیام، اس کی محکومی ومحتاجی پر فخر، احساس گناہ، پھول میں چٹان اور چٹان میں پھول جیسی خواہشات کا اظہار حمدیہ دوہوں میں کرنا ان کے لیے ذرا بھی تو مشکل نہیں ہے''

روح کو بخشے تازگی ذہنوں کو ایمان
یارب تیرا نام ہو یا تیرا قرآن

☆

میرے مالک دے مجھے ایک الگ پہچان
چٹانوں میں پھول ہوں پھولوں میں چٹان

دوہا نگاری میں فراز حامدی کی خدمات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے۔ انھوں نے ادب میں کرجاں پنچھی کا استعمال کر کے اس کو ادب میں جگہ دی ہے۔ ڈاکٹر ناصرہ بصری اس پر اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتی ہیں کہ:

''فراز حامدی نے ''کرجاں'' کا استعمال صرف اپنے اردو دوہوں میں ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس معصوم اور خوبصورت پرندے کا ذکر انھوں نے اپنی دوہا معریٰ نظم میں بھی کیا ہے جس کا عنوان ''کرجاں ہی'' ہے۔ فراز حامدی نے کرجاں کو صرف عورت تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ مرد کو بھی کرجاں سے بات کرنے اور اپنے دکھ سکھ بیان کرنے کا موقع بخشا ہے۔'' (ص۔۱۴۳)

مذکورہ دونوں کتابیں مختار صاحب ہی نے ترتیب دی ہیں اور مشاہیر اہل قلم کے مضامین تاثرات کو بڑے ہی سلیقے سے کتاب کی صورت میں منتقل کیا ہے گو یہ ان کی تخلیقی کام نہیں ہے مگر چونکہ وہ ادبی خدمات کے لئے وقف ہیں اس لیے اپنے ہم وطن اور ہم پیشہ فن کار کی عظمت کو انھوں نے اس طرح چار چاند لگا کر حقیقت

میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

﴿ مختار ٹونکی اہل قلم کی نظر میں ﴾

''مختار ٹونکی کی خوبی یہ ہے کہ وہ اردو کے کلاسیکی ادب کا گہرا ادراک رکھتے ہیں اس لئے انہیں زبان پر بھرپور عبور حاصل ہے۔جس کے بغیر کوئی بھی مزاح نگار اپنی شناخت نہیں بنا سکتا ہے وہ کسی بھی مزاحیہ صورت حال کو پیدا کرنے کے لئے صرف کسی بھی واقعہ کے مضحک پہلوؤں کو پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ زبان کے تخلیقی استعمال کے ذریعہ اس واقعہ کے لطف کا دوبالا کر دیتے ہیں۔مختار ٹونکی جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اپنے تیز مشاہدہ اور ذہانت سے اس کے سارے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کر دیتے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے۔''

(مجتبیٰ حسین ۔ لغویات)

''مختار ٹونکی کا شمار اردو ادب کے اچھے مزاح نگاروں میں کیا جانا چاہیئے۔ان کے یہاں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز بھی ملتا ہے جو ایک مزاح نگار کو کامیاب مزاح نگار بنا دیتا ہے ان کی تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کسی بھی مزاحیہ صورتحال کے پس پردہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں پر طنز اور ان کی اصلاح کا سبق بھی ملتا ہے۔ انھیں لفظوں کی جادوگری اور مزاحیہ انداز بیان پر قدرت حاصل ہے۔دراصل مختار ٹونکی نے اردو کے کلاسیکی ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے۔لہٰذا ان کے یہاں لفظوں کی جادوگری کا خوبصورت انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔''

(ڈاکٹر محبوب جہاں ۔لغویات)

''مختار ٹونکی کا نام محتاج تعارف نہیں،ان کا شمار دور حاضر کے ممتاز طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔جنھوں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے فلسفے

سے بے نیاز خود کو کلاسیکی ادب کی راہ پر گامزن رکھا ہے، ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر برصغیر ہندو پاک کے کئی رسائل میں شائع ہوتے ہیں جو مختصر مگر جامع اور بھرپور معنویت کے حامل ہوتے ہیں۔ جہاں تک ان کے فن کا تعلق ہے ان کا مقام بلند اور انداز منفرد ہے دریا کو کوزے میں سمانے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ بعض اوقات ان کی حیثیت اس قاضی کی سی ہو جاتی ہے جن کے فرمودات ناظر کو اپنی ڈاڑھی میں تنکا تلاش کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

مختار ٹونکی اپنے فن کے استاد اور مرد میدان ہیں ان کے پاس الفاظ کے گلستان ہیں وہ الفاظ کے پھول چن کر لاتے ہیں اور تحریر کی لڑی میں پروتے چلے جاتے ہیں۔ الفاظ کی الٹ پھیر اور تصرف سے فائدہ اٹھاتے ہیں انھیں کمال حاصل ہے۔ مختار ٹونکی کا قلم، قلم نہیں نشتر ہے انھوں نے زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد پولیس، ڈاکٹر، وکیل، شاعر، تنقید نگار یہاں تک کہ انھوں نے قصائی تک کو نہیں بخشا۔ اکثر اپنے نشتر چلانے یا جراحت دے دوران وہ اچانک پلٹ کر آپ کو آڑے ہاتھوں لینے سے نہیں چوکتے اور آپ بغلیں جھانکتے رہ جاتے ہیں۔''

(اقبال سلیم مشہور افسانہ نگار ماخوذ ''ظرافت'' بنگلور شمارہ نومبر ۲۰۰۵ء)

''اخبارات و رسائل کے حوالے سے مختار ٹونکی ایک جانا پہچانا نام ہے۔ وہ اپنی خوبصورت زبان اور شگفتہ تحریروں کی وجہ سے ادبی حلقوں میں ایک باوقار مقام رکھتے ہیں اللہ نے جناب مختار ٹونکی کو بڑی صلاحیتوں سے نوازہ ہے۔ خوبصورت زبان لکھنے کا جہاں سلیقہ ہے وہیں بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر بھی انھیں خوب آتا ہے۔ عام سی سنجیدہ بات میں وہ مزاح کا پہلو وہ تلاش کر لیتے ہیں اور ہلکے پھلکے طنز کے تیروں سے اسے سجاتے سنوارتے ہیں جملوں کی تراش خراش، جگہ جگہ مصرعوں

شعروں یا پھر کہاوتوں کی بڑی معنی خیز پیروڈیوں سے اپنے طنزیہ انشائیوں کو اتنا دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ قاری ان کے ساتھ ساتھ ہو لیتا ہے مختلف موضوعات میں وہ اکیلے پہلو نکالتے ہیں کہ بس بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔''

(قمر سنبھلی مشہور شاعر اور تبصرہ نگار ماخوذ رہنمائے تعلیم ستمبر ۲۰۰۴ء)

''مختار ٹونکی اردو کے ایک صاحب طرز ادیب، مشہور انشائیہ نگار اور شاعر ہیں۔ ان عنوانات بڑے ہی دلچسپ ہوتے ہیں اور عنوانات سے کہیں زیادہ وہ مضامین دلچسپ ہیں جو کہ ان عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں۔ عجیب وغریب عنوانات رکھ کر اور ان پر مضامین لکھ کر انھوں نے سماج کی برائیوں کی نشاندہی کی ہے، ان پر نشتر چلایا ہے اور ہمیں اپنے عیبوں کی طرف دیکھنے کے لیے رجوع کیا ہے۔''

(وکیل نجیب کہانی نگار ماخوذ قرطاس ناگپور مئی جون ۲۰۰۳ء)

''خدا کی قسم ! جواب نہیں ''لغویات'' کا ''فرہنگ عامرہ'' میں آج سے لفظ ''لغویات'' ہی کروس آوٹ کر دیا ہے ۔طنز ومزاح لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس صنف ادب کی تخلیق کار کی ہوتی ہے۔ وہی مزاجی اور ادرا کی کیفیت ہوتی ہے جو کہ سبز کائی میں ڈوبی ہوئی چٹان پر چڑھے اس پہاڑی بکرے کی ہوتی ہے مزہ جب ہے کہ بکرے اور کائی دونوں کا وجود برقرار رہے۔ آپ نے اپنے قلم کا وقار بھی قائم رکھا ہے اور قاری کے مضمحل دماغ میں خوشگوار تبسم کی کرن بھی دوڑا دی زبان وبیان کی چاشنی آپ کی تحریروں میں مزہ دیتی ہے۔''

(نعیم کوثر مشہور افسانہ نگار ایڈیٹر صدائے اردو بھوپال)

''جناب مختار ٹونکی کی کسی ناقد کے لیے شاعر، تنقید نگار اور مزاح نگار کی شہ شخصیات میں سے خوب تر کی تلاش بڑا مشکل کام ہے۔ وہ کم گو ہیں مگر بات میں گہرائی

رکھتے ہیں، وہ انقلابی نہیں لیکن کچھ سنہرے دھنک دار خواب ضرور پالتے ہیں۔ وہ گھنے اور سایہ دار درختوں کے نیچے راحت کوشی کے ساتھ بے آب و گیاہ صحراؤں کی خاک چھاننا بھی صحت کے لیے مفید مانتے ہیں وہ کثافت کو لطافت میں اور لطیف تر میں تبدیل کرنے کا جگر اور ہنر دونوں رکھتے اور جانتے ہیں۔

بہ حیثیت طنز و مزاح نگار انھیں ابھی ناقدین نے تولا نہیں ہے لیکن ایسا ہونے پر وہ کئی مزاح نگاروں پر بھاری پڑیں گے۔ وہ تبسم زیر لب سے لے کر فلک شگاف قہقہے بھی لگاتے ہیں۔ ان کے طنز میں بیمار زندگی کے لیے زہر ناکی نہیں بلکہ شفایابی ہے۔ ان کی خاکہ نگاری مافوق الفطرت کرداروں کے بجائے عام انسانوں کی نا ہموار زندگی کے گرد گھومتی ہے ۔ انھیں مزاح میں اسلوب، اسلوب میں عبارت اور عبارت میں لفظوں کو برتنا آتا ہے ان کے اندر کا مزاح نگار سر کے بل کھڑا ہو کر دنیا کو دیکھتا اور ٹھٹھے لگاتا ہے۔''

(مسعود اختر ماخود ادراک ادب ۱۹۹۴ء)

''مختار ٹونکی کا شمار اردو ادب کے اچھے مزاح نگاروں میں کیا جانا چاہیئے۔ ان کے یہاں پر مزاح کے ساتھ طنز بھی ملتا ہے۔ جو ایک مزاح نگار کو کامیاب مزاح نگار بنا دیتا ہے۔ ان کی تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کسی بھی صورت حال کی پس پردہ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں پر طنز اور اس کی اصلاح کا سبق بھی ملتا ہے۔ انھیں لفظوں کی جادوگری اور مزاحیہ انداز پر قدرت حاصل ہے دراصل مختار ٹونکی نے اردو کلاسیکی ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے ۔ لہٰذا ان کے یہاں پر لفظوں کی جادوگری کا خوبصورت انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔

مصنف کا کمال یہ ہے کہ اگر ایک طرف وہ اپنی ظریفانہ سرگوشیوں سے انسان کو

اس کے غموں سے نجات دلاتا ہے، تو دوسری طرف اپنے طنزیہ نشتروں سے مصلح قوم بھی واقع ہوا ہے اس نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ انسان کو اس کے اندر موجود مصائب سے نہ صرف روشناس کرایا ہے بلکہ ان کی اصلاح کا سبق بھی دیا ہے تاکہ وہ اپنی ان اوٹ پٹانگ حرکتوں سے اجتناب کر سکیں۔

(ڈاکٹر محبوب جہاں۔ ماخود، نیا دور، لکھنو۔ نومبر ۱۹۹۷ء)

☆ ☆ ☆

﴿حوالہ جات باب سوم﴾

۱ اردو ادب کی تاریخ عظیم الحق جنیدی ص ۱۸۸

۲ راجستھان میں اردو نثر کی ایک صدی ڈاکٹر قمر جہاں بیگم ص ۵۰۔۴۹

۳ ماہنامہ شگوفے مضمون مختار ٹونکی جن کے سر ہے مزاح کی کلاہ افتخار مسعود اختر ص ۴۹

۴ ایضاً ایضاً ایضاً ایضاً

۵ ادراک ادب ۱۹۹۴ء ص

۶ یہ ہے انشائیہ ازمحمد اسداللہ ص ۱۳

۷ یہ ہے انشائیہ ازمحمد اسداللہ ص ۶

۸ اوٹ پٹانگ مختار ٹونکی ص ۶

۹ اوٹ پٹانگ مختار ٹونکی ص ۸

۱۰ اوٹ پٹانگ مختار ٹونکی ص ۱۸

۱۱ اوٹ پٹانگ مختار ٹونکی ص ۱۶

۱۲ اوٹ پٹانگ مختار ٹونکی ص ۸۱

۱۳ لغویات مختار ٹونکی ص ذ

۱۴ لغویات مختار ٹونکی ص ح

۱۵ مضمون پیٹ اور پلیٹ مزخرافات ص ۴۲

۱۶ لغویات ص ۱۵

۱۷ بدعات ادب خرافات ص ۹۹

۱۸ ماہنامہ شگوفے جولائی ۲۰۱۴ء

۱۹ لغویات ص ۳۱

۲۰ اردو ادب میں طنز مزاح وزیر آغا ص ۳۶۸

۲۱ ماہنامہ شگوفے مضمون مختار ٹونکی جن کے سر ہے طنز و مزاح کی کلاہ افتخار مسعود اختر ص ۴۷

۲۲ اردو ادب میں طنز و مزاح وزیر آغا ص ۴۸

۲۳ اوٹ پٹانگ ابتدائیہ ص ۱۱

۲۴ خرافات ص ۶۱

۲۵ اور ۲۶ خرافات ص ۶۲ اور ۶۳

۲۷ مضمون اختلاف زندہ باد خرافات ص ۶۷

۲۸ مزخرافات مضمون رنگہائے رشوت ص ۱۷

۲۹ پیٹ اور پلیٹ مزخرافات ص ۴۵

۳۰ تا ۳۲ مضمون جو کھیلو گے کودو گے تو بنو گے نواب خرافات ص ۷۴۔۷۴، ۷۵

۳۳ ادب برائے ڈبل روٹی لغویات ص ۱۰۷

۳۴ سالے یہ سالے مزخرافات ص ۱۳۹

۳۵ دوپہر کے کتے لغویات ص ۴

۳۶ مضمون اردو ادب میں کتوں کا درجہ ہفوات ص ۹۸

۳۷ مضمون ایجاد کا باپ مزخرافات ص ۴۸

۳۸ مضمون روٹی تو کس طور کی کھائے مچھندر مزخرافات ص ۵۵

۳۹ مضمون آل از راؤنڈ مزخرافات ص ۶۰

۴۰ مضمون سالے یہ رسالے مزخرافات ص ۱۳۹

۴۱ اوٹ پٹانگ ۱۹۹۴ء تعداد مضامین ۱۵

۴۲ لغویات ۲۰۰۱ء تعداد مضامین ۴۲

۴۳ خرافات ۲۰۱۵ء تعداد مضامین ۴۳

۴۴ اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید ڈاکٹر پروین اظہر ص ۱۱

۴۵ اردو میں مختصر افسانے کی تعریف ڈاکٹر پروین اظہر ص ۲۲

۴۶ مختار ٹونکی شخصیت اور فن ملک فیاض احمد ص ۲۷۔۲۸

۴۷ مختار ٹونکی شخصیت اور فن ملک فیاض احمد ص ۲۸

۴۸ افسانے راجستھان کے ڈاکٹر عارفہ سلطانہ ص ۲۱۱

۴۹ مختصر افسانے کا ارتقاء پریم چند تا حال ڈاکٹر جمال آراء ص ۳۳

۵۰ سہ ماہی مجلّہ جمنا تٹ اپریل تا جون ۱۹۹۴ء

۵۱ سہ ماہی مجلّہ جمنا تٹ ۱۹۹۶ء ص ۵۰

۵۲ سہ ماہی مجلّہ جمنا تٹ جلد ۶ ص ۶۰۔۶۱

۵۳ اردو ادب میں خاکہ نگاری ڈاکٹر صابرہ سعیدی ص ۳۸

۵۴ اوٹ پٹانگ گل پوشی خزاں رسیدہ گلزار کی ص ۹۹۔۱۰۰

۵۵ خرافات مولانا راکٹ ص ۱۹۱

۵۶ مختار ٹونکی شخصیت اور فن مقالہ ملک فیاض احمد ص ۳۷

۵۷ اردو میں تحقیق از مالک رام ص ۲

۵۸ تحقیق کا فن گیان چند جین ص ۲۲،۲۳

۵۹ اردو میں اصول تحقیق ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش ص ۷

۶۰ تنقید اور اردو تنقید نگاری نورالحسن نقوی ص ۷

۶۱ تنقید اور اصول تنقید عبارت بریلوی ص ۱۳

۶۲ تحقیق کا فن گیان چند جین ص ۳۱

۶۳ اردو میں تبصرہ نگاری نفیس فاطمہ پیش رفت مئی ۲۰۱۹ء ص ۳۱

۶۴ اردو میں تبصرہ نگاری نفیس فاطمہ پیش رفت مئی ۲۰۱۹ء ص ۳۱

۶۵ ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی کا تبصرہ مختار ٹونکی اور فکر پارہ پارہ

(اس کا ایک نسخہ مجھے موصوف سے حاصل ہوا ہے لیکن اس پر ناشر موجود نہیں ہے)۔

۶۶ فکر پارہ پارہ ص ۵۲

۶۷ اردو تحقیق پر ایک تنقیدی نظر فکر پارہ پارہ ص ۲۴۷۔۲۴۸

۶۸ مطالعہ اختر شیرانی تلاش و تجزیہ مختار ٹونکی ص ۱۴

۶۹ مطالعہ اختر شیرانی تلاش و تجزیہ مختار ٹونکی ص ۹۱ (سلام و پیام ص ۳۸۷۔ ۳۸۴)

۷۰ یادگار بصر ٹونکی مختار ٹونکی ص ۴

۷۱ فکر پارہ پارہ ص ۳۴

۷۲ فکر پارہ پارہ ص ۲۹۲

۷۳ فکر پارہ پارہ ص ۳۵۷

۷۴ فکر پارہ پارہ مختار ٹونکی ص ۳۶۱

۷۵ فراز حامدی کی دوہا نگاری اہل قلم کی نظر میں ص ۱۷

۷۶ فراز حامدی کی دوہا نگاری اہل قلم کی نظر میں ص ۲۱

۷۷ فراز حامدی کی دوہا نگاری اہل قلم کی نظر میں ص ۱۰۲

۷۸ ایضا ایضا ص ۱۲۶

باب چہارم

مختار ٹونکی بحیثیت شاعر

باب چہارم

مختارؔ ٹونکی بحیثیت شاعر

اردو ادب میں شاعری کی روایت حضرت امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے لے کر مغرب سے آئی ہوئی دیگر ادبی اصناف سخن مثلاً سانیٹ، ترائیلے اور ہائیکو تک کا سفر صدیوں پرانا ہے اس کی روداد اودھی اور برج بھاشا سے منسلک رہی ہے۔ ہندوستان میں جب مغلوں کی آمد ہوئی تو یہاں پر فارسی کا چلن ہوا جس سے یہاں کی شاعری نے فارسی اور ترکی زبان کے اثرات کو قبول کیا۔ شمال میں مغل اپنے حکومت کے حدود اربعہ میں اضافہ کر رہے تھے تو ان کے مقابلے میں دکن میں بھی نئی ریاستوں کا قیام ہو رہا تھا۔ جہاں پر اردو میں عربی، فارسی اور مقامی زبانوں کے رنگ و آہنگ کو وہاں کے حکمرانوں نے اپنی سرپرستی میں لے کر پروان چڑھایا، وہی حکمراں علم دوست ہونے کی وجہ سے خود بھی شعر کہتے اور اہل ادب کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

سترہویں صدی کے آخر تک اردو شاعری دکن میں فروغ پاتی رہی۔ شمالی ہند میں اس کا آغاز ولیؔ کے دیوان کے دلی آنے کے بعد سے ہوتا ہے۔ اس سے قبل شمال میں فارسی زبان کو اہمیت حاصل تھی۔ ولیؔ کے بعد سراجؔ اورنگ آبادی نے بھی اس کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ شمال میں حاتمؔ، شاہ مبارک آبروؔ، شاکرؔ ناجی، مرزا مظہر جانؔ جاناں اور مضمونؔ جیسے باکمال شاعر ہوئے جنھوں نے اردو شاعری کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے علاوہ اردو شاعری کے عہد زریں کہے جانے والے میرؔ و سوداؔ کے دور میں کلاسیکی اصناف سخن کو عروج ہوا۔

امتداد زمانے کے ساتھ دہلی میں جب مغلیہ حکومت کمزور ہوئی اور اس پر باہری حملہ آوروں کے ساتھ اندرونی لوگوں مرہٹے، جاٹ وغیرہ نے لوٹ پاٹ کا بازار گرم کیا دہلی ویران اور تاراج ہوئی تو اہل فن سکون اور معاش کے لیے ہجرت کرنے لگے۔ لکھنو میں سکون اطمینان تھا، فارغ البالی اور خوش حالی تھی۔ وہاں پر اپنے رنگ اور مزاج کے اعتبار سے شاعری پروان چڑھ رہی تھی۔ جہاں ناسخؔ، آتشؔ، جرأتؔ، انشا،

نسیم ،شوق جیسے شعراء موجود تھے۔تو وہاں کے حکمرانوں نے بھی واسوخت ، ریختہ ،منظوم ڈرامے ،اور گیت کی اصناف میں اضافہ کیا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے زوال ماہتاب کے ساتھ حکومت برطانیہ کا آفتاب عروج بلند ہورہا تھا۔اسی کے ساتھ ہی ایک تہذیب اپنے خاتمہ کے کگار پر تھی تو دوسری تہذیب اپنے پیر جمارہی تھی تو ادب نے بھی ایسے حالات مغربی اصناف اور خیالات سے استفادہ کیا۔انیسویں اور بیسویں صدی میں اردو شعروادب میں نئے نئے تجربات اور رجحانات کے ساتھ تخلیقی ادب سامنے آیا۔مختلف تحریکوں مثلاً ترقی پسند تحریک ،علی گڑھ تحریک ،رومانی تحریک ،اور حلقہ ارباب ذوق نے نئے موضوعات ، ہیئت اور اسلوب میں تجربے کئے اور اردو کا دامن کو نئی وسعتوں ، نئے اصول اور نئے موضوعات سے بھر دیا۔

مغربی افکار وخیالات نے یہاں پر ہر فرد کو متاثر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی روایات اور اقدار کے خاتمے کا اندیشہ ہونے لگا تو اسی خدشے کے پیش نظر سرسید کی علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی ذہنی اور اخلاقی پستی کو دور کرنے میں اپنی تصانیف اور مضامین کے ذریعہ نمایاں رول ادا کیا۔تو مولانا محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کا قیام کرکے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔جس میں موضوعاتی شاعری کی جانے لگی تو نئے تجربات اور ہیئتی بدلاؤ کے ساتھ ہی شاعری کی بنیاد قائم ہوئی۔

ملکی حالات سے قطع نظر اگر راجستھان کے ادبی ماحول پر نظر ڈالیں تو یہاں پر اردو شعروادب کا آغاز انیسویں صدی میں ہوتا ہے۔مولانا احترام الدین شاغل نے اپنی تصنیف ''تذکرہ شعرائے جے پور'' میں مرزا اکبر علی بیگ گل کے دیوان کی نشاندہی کی ہے اور گل میر تقی میر کے شاگرد تھے۔

بقول ڈاکٹر نادرہ خاتون:

> مولانا شاغل نے ''تذکرہ شعرائے جے پور'' میں گل کو جے پور میں پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا ہے۔[۱]

راجپوتانے میں جب شعر وسخن کی روایت قائم ہوئی۔ تو مختلف ریاستوں میں شعروسخن کے ساتھ مشاعرے کی محفلیں بھی سجنے لگیں۔ جن کی وجہ سے اہل فن حضرات کے ذوق کو جلا ملی۔

راجستھان کے علم وادب کا گہوارہ کہے جانے والے شہر ٹونک جہاں نہ صرف ملکی بلکہ بین االاقوامی شہرت یافتہ شخصیات محمود شیرانی، اختر شیرانی، بسمل سعیدی، مخمور سعیدی ہوئیں ہیں۔ جن کی ادبی حیثیت دنیائے ادب مسلم ہے۔ اسی مردم خیز سرزمین میں مختار ٹونکی اسلاف کی ادبی میراث کے امین بنے ہوئے ہیں۔ ٹونک جہاں آئے دن طرحی مشاعرے اور شعری محفلیں ہوا کرتی تھیں مختار ٹونکی نے ٹونک کی اس دلکش ادبی فضا میں پرورش پائی۔ ان محفلوں اور مشاعروں میں وہ ایک خاموش سامع کی حیثیت سے شرکت کیا کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ٹونک میں شعروادب کی محفلیں عروج پر تھیں۔ گھر گھر میں شعروشاعری کی دھوم تھی۔ مومن اور داغ کی غزلیں بڑے ہی شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ اس دور میں ملک کے نامور شعرائے ٹونک میں تشریف لاتے تھے۔ ان میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، ماہر القادری، ساغر نظامی، غلام ربانی تاباں قابل ذکر ہیں۔

موصوف نے ان محفلوں اور شعراء کے صحبت سے استفادہ کیا تو براہ راست ان نشستوں کے اثرات ان پر ظاہر ہوئے مگر باقاعدہ شاعری کی شروعات نہیں کی۔ وہ نثر کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر چکے تھے لیکن ٹونک کے رنگا رنگ شعری ماحول نے ان کو شعر گوئی کی طرف مائل کیا۔ شعری فضا میں رہنے کے باوجود مختار صاحب شعر گوئی کی طرف دیر سے آئے یا یوں کہیں کہ وہ شاعری میں مہارت حاصل کرنے کے بعد آئے۔ موجودہ دور میں ان کا شمار ٹونک کے قابل قدر شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ گذشتہ پچاس برسوں سے تخلیقی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب انشائیہ نگار، ادب اطفال نگار اور ایک مستند طنز ومزاح نگار کے طور رجانے جاتے ہیں۔

مختار ٹونکی کی شاعری کا آغاز دوران ملازمت ہوا جب ۱۹۶۱ء میں موصوف ملازمت کے سلسلے میں ناگور گئے۔ جہاں پر کوئی شعری وادبی ماحول نہ تھا لیکن وہاں پر حمید الدین ناگوریؒ کے مزار پر مشاعرے ہوتے تھے۔ وہاں موصوف طرحی مشاعروں میں جاتے اور اپنا کلام پیش کرتے تھے۔ وہ جس اسکول میں

ملازمت کرتے تھے۔اس اسکول کے پرنسپل ان کواس کی ترغیب دیتے تھے اور کہتے کہ جب تک جنگ چل رہی ہے (اس وقت ہندو پاک کی جنگ کی وجہ سے سرحدی علاقہ ہونے پر ناگور میں (Black out) ہوجاتا تھا اور لوگ اپنا وقت گزارنے کے لئے شاعری کا کیا کرتے تھے)

آپ بچوں کو پرارتھنا کے موقع پر سنائیں۔ اس دوران مختار صاحب نے کئی موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ایک نظم جوانھوں نے اپنی ملاقات کے دوران بتائی جو اب دستیاب نہیں ہے مگر اس کے بول کچھ اس طرح سے تھے۔

بہادوروں کے دیش میں
یہ کس نے کی چڑھائی ہے
یہ کون بڑھ کے آیا ہے
یہ کس کی شامت آئی ہے

ناگور میں ہونے والے میلوں میں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ان مشاعروں میں موصوف اپنا کلام بھی پیش کر کے اپنے شعری ذوق کی تسکین کیا کرتے تھے۔ جہاں پر کبھی کبھی وہ شوقیانہ مارواڑی انداز میں بھی نظمیں سناتے تھے جو کہ مزاحیہ ہوا کرتے تھیں۔

مختار صاحب نے شعر گوئی میں ٹونک کے مشہور شاعر عبدالبصیر بصؔر صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا وہ اپنا کلام ناگور سے ڈاک سے ٹونک بھیجتے تھے اور بصؔر صاحب اس کی اصلاح کر کے واپس بھیج دیتے تھے۔

موصوف راجستھان کے ایسے شاعر ہیں جن کا کلام سلسلے وار معتبر رسائل و جرائد میں جگہ پاتا رہا ہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے ان کا کلام رسائل و جرائد کے مدیران بصد شکر یہ شائع کرتے ہیں۔

موصوف صوبائی اور ملکی سطح پر متعدد شہروں میں سینکڑوں مشاعروں میں اپنا کلام پیش کر چکے ہیں۔ راجستھان کے مشہور شہروں ناگور، بیکانیر، جودھ پور، پالی، اجمیر وغیرہ میں انھوں نے شعری نشستوں میں دھوم مچائی تو ملکی سطح پر جبل پور، بھوپال، جوناگڑھ، احمد آباد، فیروز آباد اور دہلی کے کئی مشاعروں میں ٹونک کی

نمائندگی کی ہے۔ ۲

اس کے علاوہ غیر ملکی اردو رسائل میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ تو جے پور آکاش وانی سے بھی ان کا کلام نشر ہوا ہے۔ نیز انٹرنیٹ پر بھی ان کا کلام موجود ہے۔

مختار ٹونکی صاحب کو قدیم وجدید دونوں اصناف سخن پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ، چار بیت، ہزلیات، گیت، دوہے، ماہیئے دوہا گیت، دوہا غزل، ہائیکو، سین ریو، سبھی اصناف میں انھوں نے اپنی قادرالکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

ان کا پہلا شعری مجموعہ ''سب رنگ سخن کے'' کے نام سے ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ جس میں سبھی اصناف سخن کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ماہیوں پر مشتمل مجموعہ ''صدرنگ ماہیئے'' کے نام سے جنوری ۲۰۱۳ء میں شائع ہوکر قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ان کا ایک اور مجموعہ جو کہ حمد ونعت پر مشتمل ہے ''ربنا وسیدنا'' کے نام سے ۲۰۱۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ادب اطفال پر بھی ان کا کام ہے اور انھوں نے اس سلسلے میں بچوں کے لئے بھی ایک مجموعہ ''یہ دنیا بچوں کی'' کے نام سے تیار کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا بہت سارا کلام متعدد رسائل اور جرائد میں شائع ہوا ہے لیکن وہ کتابی شکل میں نہ آسکا ہے۔

موصوف کا مطالعہ بے حد وسیع اور گہرا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدات کی بنا پر ان کے خیالات وتجربات اور جذبات میں پختگی آگئی ہے۔ ان کی شاعری خیالی دنیا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ حقیقی دنیا سے قریب تر ہے۔

مختار ٹونکی کے کلام کا تجزیہ، ان کے انداز بیان، ان کی سخن طرازی کا جائزہ، مختلف اصناف سخن سے روبرو ہوکر ہی کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کی شاعری کئی جہات میں پھیلی ہوئی ہے۔ سرسری طور پر کسی ایک صنف پر تبصرہ کرنے سے حق ادا نہ ہوگا اس لیے اجمال سے تفصیل میں جانا ہوگا۔

مختار ٹونکی کی غزل گوئی

مسعود حسین رضوی کے مطابق:

''شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے، سوئے احساس کو جگاتی ہے، مردہ جذبات کو جلاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے حوصلوں کو بڑھاتی ہے مصیبت میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے اسی شاعری کی اصناف میں غزل اردو کے اہم ترین صنف ہے۔'' [۳]

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ:

غزل اردو شاعری کا قیمتی سرمایہ ہے۔ جسے زمانے کی شدید مخالفت کے باوجود کامیاب صنف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ غزل تمام اختلافات کے باوجود اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہر دور میں جلوہ گر رہی ہے۔ غزل کے لغوی معنی تو عورتوں کے حسن و جمال کی باتیں کرنا ہے لیکن غزل نے حسن و عشق کے علاوہ سیاسی، سماجی، تاریخی، فلسفیانہ، مذہبی، اخلاقی جیسے موضوعات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ گویا کہی حیات اور کائنات اس کے مٹھی میں ہیں اس ایجاز و اختصار کی خوبی کی ہی وجہ سے اس کو اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے۔ یعنی غزل میں انسانی حیات و کائنات کا مکمل احاطہ نظر آتا ہے۔ انسان کی زندگی کے وہ واقعات، جذبات اور احساسات جو اس کی عقل و خرد کو متاثر کرتے ہیں شاعری کی روح بن جاتے ہیں۔

مختار ٹونکی صاحب نے اپنے ان ہی جذبات و احساسات کو شعر کے پیکر میں ڈھالا ہے اور اپنے عہد اور ماحول کی عکاسی کی ہے۔ ان کی غزلوں میں جو رنگ و آہنگ نظر آتا ہے وہ ان کے عہد کے تجربات اور مشاہدات کا آئینہ ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے پر ان کے فن شاعری کی عظمت اور قدر و منزلت کا احساس ہوتا ہے۔ موصوف کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ شعر کے فنی محاسن و معائب اور زبان و بیان کی خوبیوں اور خامیوں سے مکمل طور پر واقفیت رکھتے ہیں۔ روزمرہ کی زبان ہو یا تشبیہات و استعارات کا استعمال ہو مختار ٹونکی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ نہایت صراحت کے ساتھ الفاظ کو برتتے ہیں۔ ان کی صحبت سے ہر کوئی فیض یاب ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ادب کو کبھی غیر سنجیدہ نظر سے نہیں دیکھا۔ ادب کا عمیق مطالعہ ان کے شعروں میں نمایاں طور پر آتا ہے۔ انھوں نے لاتعداد غزلیں کہی ہیں لیکن سبھی معنویت سے بھرپور اور دلوں کو متاثر کرنے

والی ہیں۔جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مختار ٹونکی کی غزل کلاسیکی روایت کی پاس دار ہے،کلاسیکی شاعری میں لطافت، رنگینی، کے باوجود یکسانیت ومشابہت پائی جاتی ہے۔قدیم شعری روایت وطرز احساس سے انھوں نے اپنے فکر وفن کی تشکیل کی ہے۔ان کا طرز نگارش سادہ اور سلیس ہے۔جنسی خواہشات اور موضوعات سے دوران کی غزلوں میں تازگی اور پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے اور بہت ہی ہلکے پھلکے انداز میں وہ اپنے خیالا ت کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔مثلاً

زلف شانوں پہ لہرا گئی　　سارے رندوں کو بہکا گئی
وہ نظر پھول برسا گئی　　میری سانسوں کو مہکا گئی

تذکرہ شعرائے ٹونک میں امداد علی خاں شمیم نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

''مختار ٹونکی ایک کامیاب ادیب اور شاعر ہیں۔زبان وبیان کے اعتبار سے آپ کی شاعری میں کہیں کہیں ندرت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔شعر کی نزاکتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے غزل کہتے ہیں با محاورہ زبان کے ساتھ بیان کی شوخی اور سادگی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔''

چاند کرتا ہے فلک سے تیرا دیدار اگر
چاندنی بڑھ کے تجھی سے تو ضیاء مانگے ہے
نکہت فشاں ہیں زلفیں نکہت فروش لب ہیں
ہے رشک عطر وعنبر زلف ودہن کی خوشبو

مختار ٹونکی کی غزلوں میں حسن وعشق کا تصور بڑے ہی دلکش انداز میں بیان ہوا ہے۔ان کی غزلوں میں محبوب کے حسن وجمال کی تعریف خوبصورت الفاظ میں کی گئی ہے۔ان کے یہاں پر غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے روایتی قدروں کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔کلاسیکی شاعری کی خاص

خوبی مثلاً نازک خیالی ،معاملہ بندی ،حسن وعشق کا جمالیاتی احساس ،محبوب کے حسن کا تصور بڑی ہی تہذیب اور شائستگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔درج ذیل اشعار ان کی وضاحت کرتے ہیں ۔

جب وہ آتے ہیں خیالوں میں ساری دنیا دلہن سی لگتی ہے

ہٹا کے چہرے سے گرد وغبار کیا کہنا حیات کرتی ہے سولہ سنگھار کیا کہنا

دیکھ لے آنکھوں سے اپنی وہ ترا جوش شباب

جس نے دیکھا نہ ہو چڑھتا ہوا دریا کوئی

جس طرح کہ پھولوں میں نہاں ہوتی ہے خوشبو

اسی طرح مرے دل میں تری یاد بسی ہے

محبوب کے سراپے کے ساتھ اپنے دل کی کیفیات کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

یوں نہ ہوگا علاج دردِ دل اے مسیحا دوائیاں رکھ دے

دیکھ لے اس کو تو مصور بھی کاٹ کر اپنی انگلیاں رکھ دے

وہ اپنے پائے رنگیں کو اگر پانی میں لٹکا دیں بڑے ہی شوق سے دریا کی ساری مچھلیاں دیکھیں

بھلا دیں سارے پھولوں کو چلی آئیں لپٹ جائیں

ترے رنگیں آنچل کو اگر یہ تتلیاں دیکھیں

ان کے یہاں پر حسن وعشق کی واردات تو ہے ہی لیکن وہ اپنے آس پاس کے ماحول اور انسانی مسائل کو نظر انداز بھی نہیں کرتے ہیں ۔زندگی کے اہم مسائل ، دنیا کے بے ثباتی کے ساتھ عصری رجحانات کی عکاسی ان کی غزلوں میں ایک تاثیر پیدا کرتی ہے۔

مری صحرا نوردی پر ابھی جو طنز کرتے ہیں

مرے تلوؤں کو وہ دیکھیں مری وہ پنڈلیاں دیکھیں

اس دور کے انسانوں کا ہم نے دستور نرالہ یکھا

غیروں سے محبت ہوتی ہے اپنوں کو ستایا جاتا ہے

سختیاں ہیں راہوں کی کس قدر تمازت ہے دھوپ کے مسافر کو گیسوؤں کا سایہ دو

زندگی کا سودا ہے زندگی کے بارے میں تم ذرا تو مہلت دو سوچنے کا وقفہ دو

سماج میں ہونے والے مسائل سے انسان کو جن مجبوریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کی کسک ، ناکامیوں اور مجبوریوں سے پیدا ہونے والے غم دوراں کے ساتھ وہ غم جاناں کو بھی اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ جس کی وجہ ان کی غزلوں میں سوزش اور تڑپ کا احساس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

یہ امر بھی مجھے راشی بنانے والا تھا میں خاندان میں تنہا کمانے والا تھا

ہر اک بات پہ سر جھکا رہا ہے اب جو بات بات پہ گردن کٹانے والا تھا

جس کو دیکھو وہی منصور بنا پھرتا ہے دور حق گوئی سے خوف رسن و دار بھی ہے

میں اپنی بھوک کا اظہار کیوں کروں مختار مجھے نہ بھولے گا دنیا کو پالنے والا

ہر شاعر اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے مختار ٹونکی نے بھی اپنی غزلوں میں اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے عصری تقاضوں ، دلی کیفیات کے اور دنیا کے مسائل کے ساتھ ہی اپنی ذہنی فکر کو واضح کیا ہے۔ وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ ملک میں ہو رہے مذہبی تعصب ، بے اعتمادی ، اخلاقی پستی (جو ملک کو پستی کی طرف دھکیل رہی ہے) کے علاوہ انھوں نے بابری مسجد کے انہدام کے حادثے اور اس کے نتیجے میں ملک بھر میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ظلم و ستم کا بیان اپنے اشعار میں اشاروں میں کیا ہے۔ جس کو موجودہ دور کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

پرانے رشتوں کا گونگا بیان تو ہوگا

کھنڈر میں اپنا بھی نام و نشان تو ہوگا

چلو تلاش کریں ہم وہیں پہ رہ لیں گے

فسادیوں کا کہیں پر مکان تو ہوگا

جو پیش آئیں گے خطرے اسے بھی سمجھا دو
ہمارے دور کا بچہ جوان تو ہوگا
ابھی نہیں تو تمہارا زوال ہونے پر
تمہارے ظلم کا قصہ بیان تو ہوگا
ظلمتیں فرعون بن کر چھا گئی ہیں ہر طرف
دست موسیٰ کی طرح اجلی نشانی بھیج دے
پھر نیا وہ ابرہہ کعبے کو ڈھانے آ گیا
پھر ابابیلوں کا لشکر، کامرانی بھیج دے

سماج میں جو تلخیاں اور کڑواہٹیں شاعر محسوس کرتا ہے۔ وہ ان کو اپنے درد و غم اور سوز و گداز کے ساتھ اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ موصوف کو زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنی جادو بیانی سے اپنے اشعار میں ایک معنویت اور سحر پیدا کرتے ہیں ان کا غزلیہ کلام حسن بیان، بے تکلفی اور شیرینی سے مملو ہے جس سے ہر کس و ناکس لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کے یہاں پر مشکل تراکیب اور تشبیہات کی اضافت کے بجائے سادہ اور عام فہم زبان، لب ولہجہ میں سادگی و شگفتگی اور شستگی ہے۔ ثقیل اور غیر مانوس الفاظ سے اجتناب کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں پر رعنائی اور غنائیت نغمگی، تازگی اور دلکشی کے ساتھ ان کا نشاطیہ آہنگ ان کا طرہ امتیاز ہے۔ جن سے قاری بہ آسانی لطف اندوز ہوسکتا ہے ۔ اس کے تحت یہ اشعار مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

ترے سانسوں کی مہکتی ملے اے کاش فضا　　زندہ رہنے کو یہ دل آب و ہوا مانگے ہے
مانگنے والے ہزاروں ہیں جہاں میں یوں تو　　ترا دیوانہ مگر سب سے جدا مانگے ہے
دل و دماغ میں جو بھی خباثتیں ہوں گی　　ہمارے چہروے سے ان کی وضاحتیں ہوں گی

الغرض ان کی غزلیات میں وہ الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہے جو عام طور پر جدید شعرا کے کلام میں پائی

جاتی ہے ۔اپنے نفس مضمون کو وہ اس طرح سے ادا کرتے ہیں کہ عام قاری بھی اس سے بخوبی لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

﴿ مختار ٹونکی کی نظم نگاری ﴾

اردو ادب میں نظم کا رشتہ مغربی شاعری کے ساتھ قدیم روایتی شاعری سے بھی رہا ہے ۔ یہ قدیم روایت ہی جدیدیت کی تشکیل میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔اس لیے قدامت اور جدت کے درمیان نظم پر توجہ کی گئی۔ اس دوران ۱۸۵۷ء میں جب آزادی کی جدوجہد کو ناکامی کا سامنا ہوا اور ملک بھر میں حکومت برطانیہ کا اقتدار قائم ہوا تو ملک میں ہر چہار جانب مغربی تہذیب وعلوم کا چرچہ ہونے لگا۔اس کی وجہ سے مشرقی روایات واقدار سے توجہ کم ہوکر مغرب کے علوم کی طرف ہونے لگی تو شاعری میں بھی بدلاؤ ہونے لگے اور اور مغربی ادبیات سے مشرقی ادب میں جدید ہیئتیں اور شکلیں مثلاً سانیت، نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم، ہائیکو، ترائیلے وغیرہ اخذ کی جانے لگیں۔ان کے علاوہ ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، قطعہ وغیرہ بھی نظم کے ہی روپ ہیں۔

جہاں تک اردو شعر وسخن کا تعلق ہے تو غزل کے سرمائے کے ساتھ جب نظم کے سرمائے پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو نظم کا سرمایہ بھی غزل سے کم نظر نہیں آتا ہے۔اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی اردو نظم کا بھی آغاز ہوگیا تھا۔دوسری اصناف کے ساتھ ہی نظم کا بھی اولین گہوارہ دکن کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جہاں پر نویں صدی ہجری میں جعفر زٹلی اور افضل جھنجھانوی کے یہاں پر نظم کے نمونے ملتے ہیں۔افضل جھنجھانوی کی ''بکٹ کہانی'' ایک منظوم افسانہ ہے جو کہ بارہ ماسہ کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

دکن کے بعد شمالی ہند میں پر نظم کی ابتداء ہوئی تھی۔شمالی ہند کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو یہاں ولی کے دیوان کی آمد کے بعد غزل کے ساتھ ہی نظم میں بھی کئی تجربات کئے گئے۔نظیر اکبرآبادی اکیلے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے موضوعاتی نظمیں لکھیں۔جن میں انھوں نے ہندوستانی تہذیب کے ساتھ تہوار، میلے، موسم، پھل، مذہب، مذہبی اور سماجی شخصیات کے ساتھ دنیا کے بے ثباتی اور بھلائی کی طرف ترغیب کے ساتھ بہترین مرقع کشی کی ہے۔اکبرالہ آبادی کے یہاں پر مغربی تہذیب سے بیزاری اور مشرقی تہذیب کی علم برداری

کا اعلان ملتا ہے ۔ چونکہ وہ مشرقی تہذیب کے دل دادہ تھے اور اس سے ان کو بڑی محبت تھی وہ اس کے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے لہٰذا ان کے یہاں پر مغرب کے تعلق سے زبردست طنز ملتا ہے ۔

سماجی اور تہذیبی اقدار کی پاسداری کے علاوہ جب ہم اردو ادب کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں ۔تو وہاں پر مولانا محمد حسین آزاؔد اور مولانا الطاف حسین حالؔی نمایاں نظر آتے ہیں ۔جنھوں نے اردو ادب میں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدید نظم کی بھی بنیاد ڈالی ۔اس سلسلے میں انھوں نے لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی ۔ جہاں پر اردو نظم کو فروغ حاصل ہوا ۔اس انجمن کے تحت مخصوص موضوع دیا جاتا تھا ۔جس کے تحت ہی نظمیں کہی جاتی تھیں اور پھر منعقد ہونے والے مشاعروں میں پڑھی جاتی تھیں ۔

جدید نظم کی اس روایت اور وراثت کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے اگلی صف کے شعراء میں پنڈت برج نرائن چکبستؔ ، جوشؔ ملیح آبادی ،فیض احمد فیضؔ ، میراجی ، اخؔتر الایمان ،علی سردار جعفرؔی ،مجاؔز ،مخدوؔم ، کیفؔی آعظمی ،ن ،م ،راشؔد ،ساحؔر لدھیانوی جیسے شعراء کا اہم رول رہا ہے ۔جنھوں نے اردو نظم کو ایک بلندی اور عروج عطا کیا ہے ۔

موجودہ عہد کی نظم نگاری کو جب ہم راجستھان کے تناظر میں دیکھتے ہیں ۔اس سلسلے میں ہم کو یہاں کے مردم خیز شہر ٹونک میں مختاؔر ٹونکی کی شخصیت نظر آتی ہے ۔جنھوں نے نظم نگاری کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں خاص طور پر بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ادب اطفال پر بہت کچھ کہا ہے ۔ جو وقت کی اہم ضرورت ہے ۔ اس کے علاوہ اگر دیکھا جائے تو ان کی نظموں مین بھی وہی رنگ وآہنگ نظر آتا ہے ۔ جو ان کی غزلیات میں دیکھنے کو ملتا ہے ۔اگر چہ انھوں نے نظمیں کم ہی کہی ہیں جن کی تعداد ہی کل گیارہ ہے ۔لیکن انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت ،عمیق مطالعہ اور مہارت سے کامیاب اور عمدہ نظمیں کہی ہیں ۔ جو ان کے مجموعے میں شامل نہیں ہیں لیکن وہ نظمیں اردو شاعری کی اہم کڑی ہیں ۔لیکن ان کی چند نظمیں محبت ، اعتراف محبت ،فراموشگار سے خطاب ،نذر اختر ، گاندھی ، پرتاپ ،میرا وطن ہندوستان ،خطرۂ مستقبل ، پیارا وطن ، تذبذب ،نغمۂ آزادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

مختار ٹونکی کی ان نظموں میں رومانی ، جمالیاتی ،قومی ، وطنی ،معاشرتی رنگ کی آمیزش کے ساتھ قوس وقزح کا مجموعہ ہے۔ان کی تمام ہی نظمیں عام فہم اور سادہ زبان میں ہیں۔ان کے مطالعے سے قاری کو کسی بھی طرح کے کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے بلکہ قاری آسانی سے ان کے مقصد اور نظریہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ان کے یہاں پر کسی بھی طرح کا کوئی بھی ابہام نہیں ہے اور وہ آسانی سے اپنی بات کو قاری کے ذہن و دماغ میں سرایت کرا دیتے ہیں۔

انھوں نے عام طور پر پابند نظموں پر ہی اپنی توجہ صرف کی ہے اور آزاد اور معریٰ نظموں سے پرہیز کیا ہے۔ان کی نظمیں پابند نظموں کی بہترین مثال ہیں۔مختار صاحب کسی بھی تحریک یا نظریہ سے منسلک نہیں رہے اور نہ ہی وہ جدیدیت کے سمندر میں غوطہ زن ہوئے۔ بلکہ انھوں نے اپنی لئے ایک الگ راہ نکالی جو نہ تو کسی نظریہ سے متاثر تھی اور نہ ہی کسی تحریک سے منسلک۔اسی راہ پر گامزن رہتے ہوئے انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھا۔وہ شاعری میں صنعت گری کو کاریگری نہیں مانتے ہیں بلکہ وہ شاعری کو زندگی کا حقیقی ترجمان مانتے ہیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں غزلوں کی ہی طرح سے جذبہ، خیال ،شدت احساس اور زندگی کے مسائل کو سمیٹا ہے اور ان کے حقائق کے بیان کے ساتھ ان کے تدارک کی کوشش بھی کی ہے کیوں کہ انھوں نے اپنے یہاں پر موضوع اور مواد کو اہمیت دی ہے۔اس سلسلے میں وہ بے جا الفاظ و تراکیب سے اجتناب کرتے ہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرنے میں وہ یقین رکھتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کے کلام میں تاثر ہے۔مختار ٹونکی کی اولین نظم ''حدیث وطن'' کے نام سے نیا دور لکھنو کے شمارہ جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

ان کے مجموعے ''سب رنگ سخن کے'' میں ان کی پہلی نظم ''محبت'' ہے جو پاکیزہ جذبات کی نمائندگی کرتی ہے۔یہ نظم عشق حقیقی سے الفت اور محبت کے ساتھ خلوص کی کیفیت کا بیان کرتے ہوئے محبت کو خدا کا دیا ہوا انمول تحفہ قرار دیتی ہے۔محبت نہ صرف ایک پاک جذبہ ہے بلکہ اس سے لوگوں کو راحت دینے کے ساتھ ساتھ زندگی کا نظام بھی قایم ہے۔محبت کی توضیح وہ اس طرح سے کرتے ہیں کہ:

خدا اک عطیہ ہے خدا کی ایک نعمت ہے
گراں مایہ یہ تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے
محبت نور یزداں ہے محبت ظل سبحانی
محبت جام عرفاں ہے محبت کیف ایمانی
محبت آب حیواں ہے محبت ابر نیسانی
سراسر یہ سعادت ہے سراپا ایک رحمت ہے
محبت ایک تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے
محبت باعث امکاں محبت جان عالم ہے
محبت زیور انساں محبت حسن آدم ہے
محبت آیئہ رحماں محبت اسم آعظم ہے
نظام زندگی قائم محبت کی بدولت ہے
محبت ایک تحفہ ہے محبت ایک دولت ہے

اسی طرح سے وہ اپنی دوسری نظم ''تذبذب'' جو کہ ان کی رومانی نظم ہے۔جس میں وہ اپنے محبت کے جذبات کو مختلف کیفیات کے پیرائے میں نہایت ہی عمدہ الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ اس نظم میں موصوف محبوب سے محبت کے اظہار کے اعتراف میں اپنی الجھن کو بیان کرنے سے قبل محبوب کی تعریف کرتے ہیں کہ:

اپنے جذبات کو بیدار کروں یا نہ کروں
سوچتا ہوں میں تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تو پری چہرہ پری پیکر و مہتاب جبیں
تو بہاروں سے ستاروں سے سوا تر ہے حسین
مہ لقا تو ہے مرے دل کو ہے اس کا بھی یقیں

حسن کا تیرے میں اظہار کروں یا نہ کروں

سوچتا ہوں میں تجھے پیار کروں یا نہ کروں

پھر اپنی محبت کا اظہار کرنے کے ساتھ ہی وہ اپنے حالات کی تبدیلی کا بیان کرتے ہوئے اپنے تذبذب سے اپنے محبوب کو روشناس کراتے ہیں:۔

میں ہوں اک شاعر نادار تجھے کیا معلوم

ہوں مصائب میں گرفتار تجھے کیا معلوم

ہر خوشی مجھ سے ہے بیزار تجھے کیا معلوم

تری خوشیوں کو بھی غم بار کروں یا نہ کروں

سوچتا ہوں میں تجھے پیار کروں یا نہ کروں

نظم کے خاتمے پر اپنے مقصد کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مجھ سے کیا پائے گی میری رفاقت کے سوا

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اس حسیں خواب سے بیدار کروں یا نہ کروں

سوچتا ہوں میں تجھے پیار کروں یا نہ کروں

اس نظم کے آخری بند میں مختار صاحب نے فیض احمد فیضؔ کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کے ایک شعر میں تغیر و تبدل کیا ہے۔ فیض کی نظم کے تصرف سے انھوں نے اپنی نظم کے مرکزی خیال کو وسعت اور کشادگی دی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی یہ نظم حسن و عشق کی حسیں وادیوں سے نکل کر حقیقی دنیا کی ترجمانی کرتی ہے۔

''تذبذب'' میں جہاں فیض کا رنگ اپنایا گیا ہے تو دوسری طرف ان کی نظم ''اعتراف محبت'' میں اختر

شیرانی کی شعریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔اس نظم میں وہ اپنے محبوب سے اپنی محبت کا اعتراف اپنی زندگی، اپنی خوشی، بندگی اور عبادت تسلیم کرتے ہیں اور اس کی محبت میں ساری دنیا کو بھلا دینے کے لیے تیار ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ:

تمہاری شمع رخ کا ہوگیا ہوں میں تو پروانہ
تمہاری مست آنکھوں سے ہوا ہوں خوب مستانہ
تمہارے حسن زیبا کا ہوا ہوں دل سے دیوانہ
مجھے دنیا کی کیا پروا مجھے تو تم سے نسبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے مجھے تم سے محبت ہے

(اعتراف محبت)

مختار ٹونکی نظموں میں جمالیاتی پہلوؤں کو بہت ہی دل کش اور مؤثر پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ان کی سبھی نظمیں انفرادیت سے آشنا ہوکر بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔ ہر شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی شاعری میں اس کے گرد وپیش کے ماحول کی عکاسی جھلکتی ہے۔مختار صاحب کی نظمیں عہد حاضر کے حالات، پریشانیاں، انسانی کشمکش، معاشرے میں پھیلی بیزاری ونفرت اور افسردگی کی بھی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ جو انسانی زندگی میں مایوسی، بے یقینی اور عدم اطمینان کا ماحول پیدا کرتی ہیں۔ان کی نظم ''خطرۂ مستقبل'' میں سماج کی بدانتظامی، مذہبی تعصب، قتل وغارت گری جیسے تلخ سماجی حقائق کو پیش کیا ہے۔اس کے مطالعہ سے ان کے احساس دل، لہجہ میں تلخی اور پریشانی کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بستیاں افکار کی ساری جلادی جائیں گی
ذہن ودل پر بجلیاں ایسی گرادی جائیں گی
نفرتوں کا یہ اندھیرا اور بڑھتا جائے گا
رفتہ رفتہ پیار کی شمعیں بجھادی جائیں گی

جتنے بھی مظلوم ہوں گے چیختے رہ جائیں گے
ان کی چیخیں قہقہوں ہی میں دبا دی جائیں گی

زور کچھ حیوانیت کا اس قدر بڑھ جائے گا
عظمتیں انسانیت کی سب بھلا دی جائیں گی

(خطرۂ مستقبل)

انھوں نے انسانی زندگی کی جو تلخ حقیقت بیان کی ہے۔ اس میں ذہنی اضطراب کے ساتھ اندرونی تڑپ خلفشار اور بے چینی ہے جو قاری کو لرزاں کر دیتی ہے۔ اس نظم میں موصوف نے بے باکی سے کام لیا ہے مگر ان کا انداز بیان بھڑکانے والا نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی بات کو نہایت ہی سادہ اور سلیس الفاظ میں بیان کر کے صبر و تحمل کی تلقین کی ہے۔

زندگی کے ان حقائق کی وضاحت کے علاوہ ان کی دوسری نظمیں بھی ہیں۔ جو کہ حب الوطنی کے جذبے سے معمور ہیں۔ وطن سے ان کو بہت محبت ہے۔ اس کی وضاحت ان کی نظمیں ''میرا وطن ہندوستان'' ''پیارا وطن'' اور ''نغمۂ آزادی'' وغیرہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ اپنے وطن کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے نوجوان نسل کے دلوں میں وطن کے لیے جینے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ اور ملک کی شان و شوکت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

عصر نو کی عظمتیں ہیں شان تہذیب کہن
طرز یہ جمہوریت کی سیکولر اس کا چلن
ہند کے دستور میں ہے اب نہ فرق ما و من
شعبہ ہائے زندگی میں بڑھ گیا میرا وطن

بڑھتا ہوا یہ قافلہ ہر ایک ہی منزل میں ہے
یہ مرا پیارا وطن دنیا کی آب و گل میں ہے

(پیارا وطن)

اپنے ملک ہندوستان اور ہمالیہ کی عظمت میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اس کے دریا دل نشیں
اس کے میداں دل پسند
باغ ہائے دل ربا
اور ہمالہ سر بلند
جو چومتا ہے جو آسماں میرا وطن ہندوستان

(میرا وطن ہندوستان)

ایک سچے محبّ وطن ہونے کے ناطے وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ملک ہندوستان میں کسی بھی قسم کا رنگ ونسل، زبان وتہذیب اور مذہب کے نام پر کوئی بھی اختلاف نہ ہو۔ سب ہی اس چمن کے پھول ہیں۔ جس سے اس چمن کی زینت ہے۔ آپس کے بھید بھاؤ اور منافرت کو مٹا کر مل جل کر رہیں تاکہ ہمارا یہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ اس سلسلے میں انھوں نے قومی یکجہتی کے تحت نظم ''نغمۂ آزادی'' لکھی جس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

جمہوریت کی خوشبو پھیلی چمن چمن ہے
کیا ذاتیں اور قومیں اب سیکولر چلن ہے
ہندو ہو یا مسلماں سب کا یہی وطن ہے
سب کو برابری کا درجہ عطا کیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

(نغمۂ آزادی)

ہندوستان کے عظیم شخصیت گاندھی جی جنھوں نے اس ملک کی آزادی اور قومی ذات پات کو دور کرنے

لوگوں کے دلوں سے نفرت کو مٹانے اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے اپنی پوری زندگی لگا دی تھی ۔ موصوف نے اپنی ایک نظم جس کا عنوان ''گاندھی'' ہے میں ان کی بلند خیالی اور پختہ ارادوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے تاریخی شخصیات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔جن میں خاص طور پر رانا پرتاپ کی بہادری اور قوم پرستی کے ساتھ اپنی آن بان شان سے جینا اور کسی کے آگے سرنگون نہ ہونے کی خوبیاں بیان کی ہیں۔

اردو ادب میں بلند مرتبہ شاعر اخترؔ شیرانی جن کا تعلق بھی اسی شہر ٹونک سے تھا۔جو رومانی تحریک کے نمایاں اور دنیائے ادب کے بلند مرتبہ شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔جن کی شاعرانہ فن کاری اور لطافت کا بیان اپنی نظم ''نذر اختر'' میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

تو نے انجام دیں یوں اردو ادب کی خدمت
نام نامی کی ترے آج ہے ہر سو شہرت
جیسے ہوتی ہے ستاروں سے فلک کی زینت
اس طرح تو نے بڑھائی ہے وطن کی عظمت
نازش ٹونک بجا ہے تجھے صد بار کہوں
تجھ کو اقلیم سخن کا میں شہر یار کہوں

ان تمام نظموں کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان نظموں میں موضوعاتی تسلسل ہے۔انداز بیان میں روانی ہے اور وہ اپنے مطمح نظر کو واضح کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ان کی نظم نگاری بھی ان کی غزل گوئی کی طرح شاندار ہے۔

مختارؔ ٹونکی کی رباعیات

رباعی ایک پر لطف صنف سخن ہے۔جس کی تاثر زبان و بیان میں پوشیدہ ہے۔اس میں خیالات کی بلندی کا احساس ہوتا ہے۔اس میں ہر قسم کے موضوعات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔خواہ وہ عشقیہ مضامین ہوں

یا فلسفہ وتصوف ، مذہبی ، اخلاقی مضامین ہوں یا پھر سیاسی ،سماجی ، تاریخی وتمدنی ہوں ،حمد ،نعت ،منقبت ہوں یا پھر مزاح ،شوخی وغیرہ کے مضامین ہوں ۔غرض ہر قسم کے موضوعات اس میں شامل ہیں ۔لیکن اس میں اخلاقی پہلو پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ ایک لڑکا جوز کی گوٹیاں بنا کر کھیل رہا تھا اور ساری گوٹیاں ایک گڈھے میں گر گئیں بس ایک جوز کنارے پر تھوڑی دیر تک رکا رہا اور پھر وہ بھی گڈھے میں گر گیا تو لڑکا خوشی سے چلایا:

غلطاں غلطاں ہمی رود طالب گوئے

رودکی کو یہ بحر پسند آئی اس نے اس بحر میں چار مصرعہ کہے اور اس طرح سے رباعی کا وجود ہوا۔

اردو کی دیگر اصناف کی طرح سے رباعی بھی فارسی کے زیر اثر اردو میں آئی ہے ۔دوسری اصناف کی طرح سے رباعی کا بھی شرف دکن کو ہی حاصل ہے اور پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کو پہلا رباعی گو شاعر تسلیم کیا جاتا ہے ۔

دکن سے جب رباعی شمالی ہند میں آئی اور اس کی طرف توجہ کی گئی تو یہاں پر بھی اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور میرؔ ، دردؔ ،سوداؔ ، مصحفیؔ ، میر حسنؔ ، جرأتؔ ،حسرتؔ ،انشاءؔ ،غالبؔ ،مومنؔ ، ذوقؔ وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں رباعیاں کہی ہیں ۔ ان کے علاوہ مرثیہ گو شعراء نے بھی اپنے خاص فکر کے تحت رباعیاں کہی ہیں کیونکہ مرثیہ پڑھنے سے قبل وہ تمہید کے لیے چند رباعیاں پیش کیا کرتے تھے ۔

ملک میں حکومت برطانیہ کے قیام کے بعد مغربی تعلیم اور شعراء کا اثر اردو شاعری پر بھی ہوا تو سرسید نے نوجوانوں کو مغربی تعلیم کی طرف متوجہ کیا تو دوسری جانب حالیؔ اور آزادؔ نے رباعی کے ذریعہ اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔

دور جدید کو رباعی کے لیے ترقی یافتہ دور کہا جاسکتا ہے ۔ جوش ملیح آبادی ،فراق گورکھپوری ، امجد حیدر آبادی وغیرہ نے رباعی کو بام عروج پر پہنچایا۔ ہمارے دور کو تو رباعی کے لیے نشاط ثانیہ کو دور کہا جارہا ہے کئی شعراء اس کے فروغ کے لیے بڑی شد و مد سے کام لے رہے ہیں ۔ان ہی شعراء میں ایک نام مختارؔ ٹونکی

کا بھی ہے ۔انھوں نے شاعری میں غزل اور نظم کے ساتھ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی رباعیات بھی بڑی دل کش اور پر کیف ہیں جو اپنے موضوعات کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔

رباعی ایک مشکل صنف سخن مانی جاتی ہے۔جس کا پورا دارو مدار اس کے اوزان پر منحصر ہوتا ہے۔اسی لیے اس کو برتنا ایک مشکل ترین امر ہے۔مختارؔ ٹونکی رباعی پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ:

☆

جب مشق ومہارت ہو رباعی کہنا　　کچھ شعری ریاضت ہو رباعی کہنا
آسان نہیں یہ کار سخن اے مختارؔ　　اوزان پہ قدرت ہو رباعی کہنا

اور یہ بھی کہ:

کہتے ہیں مشکل ہے رباعی کہنا　　اک دقت کامل ہے رباعی کہنا
اوزان نہ سمجھے گا تو کہے گا کیسے　　اوزان پہ حامل ہے رباعی کہنا

مختارؔ ٹونکی کی رباعی کے مطالعے سے یہ بات وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ ان کی رباعیات پر تاثیر ہونے کے علاوہ سادہ سلیس، پرکشش، سادگی سے بھرپور اور بے حد معنی آفریں ہیں۔ان کے مجموعے میں کل ۲۵ رباعیات ہیں اور سبھی میں سلاست، روانی، پختگی، تازگی اور سرور کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی رباعیات میں مذہبی رواداری کے ساتھ اخلاقی درس اور فطرت کے مناظر اور انسانیت کے مختلف پہلوؤں بھی نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

مذہبی اور دینی رباعیات میں عشق حقیقی سے والہانہ محبت اور عقیدت کا اظہار ملتا ہے جن میں وہ خدا کی بارگاہ میں اس کے دیدار کے طلب گار ہیں۔خدا کی شان میں کہی گئی یہ رباعیات شان الٰہی کا مظہر ہیں کہ خدا کا جلوہ اس کا نور ہر شئی میں موجود ہے وہ خدائے تعالیٰ کی حمد وثنا اس طرح کرتے ہیں کہ:

☆

تو خالق و قہار وکریم و باصر　　تو مالک وجبار و رحیم وناصر

کب تک جیوں امید کا دامن تھامے　　دامن مرا بھر دے اے قسیم وقادر

☆

ہے نور سحر شام کا گیسو تو ہے　　ہر پھول کی رنگت میں ہے خوشبو تو ہے
آنکھیں ہوں اگر دل کی تو دیکھیں تجھکو　　ہر چیز میں پوشیدہ ہے ہر سو تو ہے

☆

سب کچھ ہو عطا دنیا کی دولت دیدے　　ہر قسم کے چاہے تو سعادت دیدے
کچھ اور نہ چاہوں میں علاوہ اس کے　　تو مجھ کو خدا صرف محبت دیدے

☆

پھر پھر کے بہت سے دشت و دریا دیکھے　　جا جا کے برابر کوہ و صحراء دیکھے
مقصد نہ ملا سب کو کھنگالا ہم نے　　جلوہ تو خدا کا چشم بینا دیکھے

☆

شائستۂ اطوار بنا دے مولا　　وارفتۂ کردار بنا دے مولا
ظلمات کے مسکن کو تو میرے دل کو　　گنجینۂ انوار بنا دے مولا

رباعی میں اخلاق اور حکمت کو اصل موضوع مانا جاتا ہے۔ پند و نصیحت کے موضوعات کو بڑی عمدگی اور سلاست و روانی اور نفاست و دلآویزی کے ساتھ شعری پیکر میں ماقلّ ودلّ (یعنی مختصر لیکن مکمل) کے انداز میں ڈھالنا بڑا ہی مشکل مرحلہ ہے۔ اخلاقی مضمون میں انسانی برادری سے تعلق رکھنے کے ساتھ اچھی بری ہر قسم کی کیفیت اور صورتحال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مختؔار ٹونکی نے بھی بڑی عمدگی کے ساتھ اپنی رباعیات میں اخلاقی و اصلاحی مضامین کو پیش کیا ہے۔ ان کی رباعیاں زندگی کے مسائل اور پریشانی، تنگی، مفلسی، غم روزگار اور انسانی رشتوں کے حقائق سے پردہ اٹھاتی اور انسانیت کا پیغام دیتی ہیں۔ ان کی کچھ رباعیات ملاحظہ ہوں:

☆

کیا خوب ہیں اس دور کے لوگوں کے طریق　　اپنے کو سمجھتے ہیں جو حد درجہ لئیق
اوروں کو وہ اخلاق سکھانے والے　　ہوتے توہین لس، نام کے ہوتے ہیں خلیق
ممکن ہوتو خاموش رہو مت بولو　　بہتر ہے زبان بند رکھو کیوں کھولو
ہو جائے اگر بولنا تم پر لازم　　بس میٹھے ہی الفاظ کے موتی رولو

☆

طوفان کے رخ کو بھی بدل سکتے ہیں　　ہر آگ کے دریا سے، نکل سکتے ہیں
گر راہ میں آجائے کوئی موقع تو　　ہم سانپ کے سر کو بھی کچل سکتے ہیں

☆

احساس کی دولت کو دیا کرتے ہیں　　وہ لوگ حقیقت میں جیا کرتے ہیں
دکھ، درد، مصائب کو بھلا کر اپنے　　اوروں کے جو غم بانٹ لیا کرتے ہیں

☆

عسرت میں عزت کو بنائے رکھنا　　کردار کی عظمت کو بنائے رکھنا
خودداری وغیرت کا تقاضا یہ ہے　　اجداد کی حرمت کو بنائے رکھنا

☆

عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی کا رنگ بھی ان کی رباعیات میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جہاں ان کے محبوب کے سراپا، اس کے حسن و جمال، نرگسیت اور عاشقانہ جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔

☆

مٹ ہی وہ گئے عشق میں بس پاک ہوئے　　دیوانے کہاں صاحب ادراک ہوئے
جب شمع جلی بزم میں تو یوں تھا تماشا　　پروانے جلے جل کے وہیں خاک ہوئے

☆

یہ لب کہ تبسم کہ ردا ہو جیسے　　رخسار بہاروں کی قبا ہو جیسے
یہ آنکھیں یہ پلکیں یہ جبیں اور یہ حیا　　چہرے پہ کوئی پھول کھلا ہو جیسے

☆

انکار محبت نہ ہوا ہے نہ ہوا　　اقرار محبت نہ ہوا ہے نہ ہوا
آنکھوں سے چھپائے مگر کوئی کیسے　　اظہار محبت نہ ہوا ہے نہ ہوا

☆

شیریں نہ رہی کوئی بھی لیلیٰ نہ رہی　　اختؔر کے زمانے کی وہ سلمیٰ نہ رہی
بازار میں مل جائیں گے یوسف لیکن　　یوسف کے لیے ہائے زلیخا نہ رہی

فرقہ پرستی اور فسادات جن کی وجہ سے نہ صرف ملک متاثر ہوتا ہے بلکہ تمام دنیا پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ایسے واقعات انسانی زندگی کا سکون اور چین چھین لیتے ہیں اور دلوں کو ہلا دینے کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی نم کر دیتے ہیں۔تو بھلا اسی سماج اور معاشرے کا ایک فرد (شاعر) ان سب سے کیسے دور رہ سکتا ہے۔اور اس کو کہنا پڑتا ہے کہ:

سینوں میں اترتے ہوئے خنجر دیکھوں　　شعلے میں بھڑکتے ہوئے گھر گھر دیکھوں
میں نے تو کبھی خواب نہ دیکھا ایسا　　آنکھوں سے بھلا کیسے یہ منظر دیکھوں

انسانی سماج اور انسانی مسائل کے ساتھ ساتھ انھوں نے قدرتی منظر کی بھی بہترین منظر کشی کی ہے۔ فطرت کے تقاضوں کی اہمیت کو بتاتے ہوئے ان پر غور وفکر کرنے کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں کہ یہ بڑی کائنات آخر کیوں پیدا کی گئی ہے:۔

ان چاند ستاروں میں الجھتا کیوں ہے　　پھولوں کی قطاروں میں الجھتا کیوں ہے
اسرار ہیں ہستی کے سمجھنا مشکل　　قدرت کے نظاروں میں الجھتا کیوں ہے

☆

خورشید وقمر یہ پھول ستارے کیا ہیں　　یہ ارض وسما دنیا کے نظارے کیا ہیں
پہلے تو بشر اپنی ہی حقیقت سمجھے　　پھر لے گا سمجھ، ہستی کے اشارے کیا ہیں

☆

جنت سی اک ابھر رہی ہے دیکھو　　ہر شئی کیسی نکھر رہی ہے دیکھو
کہتے ہیں ہم سے روز وشب کے منظر　　فطرت ہر دم سنور رہی ہے دیکھو

مختار ٹونکی کی رباعیات میں فکر وتخیل اور اظہار بیان کی آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے۔ موصوف نے اپنے تخئیلات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے خیالات ہم کو آج کے دور پر طنز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ رباعی ملاحظہ ہو:۔

بس اتنی سی ہے رام کہانی میری　　اس طور سے بیتی ہے جوانی میری
جو کام کیا راس نہ آیا میرا　　لوگوں نے کبھی قدر نہ جانی میری

☆

سمجھا تھا جنھیں اپنا، پرائے نکلے　　افسوس وہی جان کے پیاسے نکلے
میں چنتا رہا خواہش خوشبو لے کر　　ہر پھول کے دامن میں بھی کانٹے نکلے

مختار ٹونکی کی قطعات نگاری

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ قطع کا مطلب ٹکڑے کے ہیں یعنی اشعار کا وہ مجموعہ جس میں تسلسل کے ساتھ کوئی مضمون بیان کیا جائے اور تمام ہی مصرعوں کا آپس میں باہم ربط ہو۔ قطعہ کی تعریف میں آتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق قطعہ کی حسب ذیل شرطیں ہیں:۔

۱۔۔۔ جملہ اشعا، رقصیدہ اور غزل کے مانند ہم وزن وہم قافیہ ہوں۔

۲۔۔۔قصیدہ، غزل مسلسل یا مثنوی کی طرح اس میں بھی معنی ربط ہو۔ یعنی کوئی مسلسل واقعہ یا مضمون کیا گیا ہو۔

۳۔۔۔ کم سے کم دو شعر ہوں لیکن زیادہ کی کوئی حد متعین نہیں ہے۔

۴۔۔۔ اشعار کے لیے کسی بحر یا وزن کی تخصیص نہیں ہے لیکن رباعی کی مخصوص بحر اور ازان سے مختلف ہونا ضروری ہے۔

۵۔۔۔ پہلا مصرعہ عموماً بغیر قافیہ ہوتا ہے اور اگر قافیہ بھی لایا جائے تو کوئی ہرج نہیں ہے[۱]

قطعہ میں شاعر کسی بھی قسم کے واقعات اور خیالات کو پیش کرسکتا ہے۔اس کے مضامین یا موضوعات میں کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ قطعہ ایک مختصر ترین صنف سخن ہے۔جس میں چار مصرعوں میں کسی بھی مخصوص خیال اور تجربہ کو پر اثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔قطعہ کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔

قطعہ کے حوالے سے معلوم ہوا کہ قطعہ بھی رباعی کی طرح سے نظم کا ایک مختصر سا پیمانہ ہے مگر دونوں میں فرق اور امتیاز بنیادی طور پر فنی اور ہیئتی ہے ۔ بقول مشہور قطعہ نگار اختر انصاری کے مطابق.:

''قطعہ ایک سمٹی ہوئی مختصر نظم ہوتا ہے جس میں تسلسل خیال بھی پایا جاتا ہے'' [۲]

قدیم شعراء کے یہاں پر قطعات کی حیثیت رباعی ہی کی طرح باندی یا لونڈی کی تھی۔یعنی قطعہ کوئی منفرد یا آزاد صنف سخن کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔لیکن جدید شاعری کی تحریک نے جب نظم کی اہمیت بڑھائی تو پھر قطعہ کو بھی پروان چڑھنے کا موقع مل گیا۔بیسویں صدی میں فانؔی بدایونی،تلوک چند محرومؔ اور اخترؔ شیرانی نے باقاعدہ ایک صنف کی حیثیت سے اس کو قبول کیا اور ہر طرح کے موضوعات کو اس میں پیش کیا ہے۔ان کے بعد جوشؔ ملیح آبادی،اخترؔ انصاری،نریش کمار شادؔ کے ساتھ احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے بھی اس کو عروج پر پہنچایا۔ آج کل کے مشاعرے میں شعراء اپنا کلام سنانے سے پہلے کوئی قطعہ بھی پڑھتے ہیں۔اس کے ساتھ اخبارات میں بھی بطور کالم قطعہ کا رواج ہوگیا ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں بیان کیا جاچکا ہے کہ مختارؔ ٹونکی کا شاعری کا کینواس بہت وسیع ہے۔ان کے شعری مجموعے ''سب رنگ سخن کے'' کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں شاعری کے سب ہی رنگ ملیں گے۔ان کی

غزلوں ،نظموں ، چار بیتوں ،رباعیوں ، دوہوں وغیرہ میں فکر و خیال اور جذبات و احساسات کے جو مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں تقریباً وہ تمام ہی رنگ ان کے قطعات میں بھی ہم کو دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جن خیالات کو مختارؔ ٹونکی نے اپنی نظموں میں تفصیل کے ساتھ اور رباعیات میں جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان کو ان قطعات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

انھوں نے عام طور پر چار مصرعوں پر مشتمل قطعات کہے ہیں اور انھیں میں جہاں معنی کے طور پر اپنی بات کو مکمل کیا ہے۔دوسرے یہ کہ انھوں نے قطعات پر عناوین درج نہیں کئے ہیں۔ یہ قطعہ سننے اور پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ مفہوم کے منزلوں سے خود گزرے اور لطف حاصل کرے۔شروعات کے طور پر ان کا ایک حمدیہ اور ایک نعتیہ قطعہ پیش ہے۔

☆

یہ تو ممکن نہیں خوشبو کو ہوا کو دیکھو　　روح کو جان کو صوت و صدا کو دیکھو
از زمیں تا بہ فلک بکھری ہوئی ہے ہر سو　　چشم بینا ہو اگر شان خدا کو دیکھو

یہ عروج و اوج و رفعتیں بلغ العلیٰ بکمالہ　　یہ جمال و نور تابشیں کشف الدجیٰ بجمالہ
جو سبھی کو پیاری ہیں خصلتیں حسنت جمیع خصالہ　　لو درود پڑھنے کی برکتیں صلوعلیہ وآلہ

چند مزید قطعات اور بھی درج ہیں۔جن کے مطالعے سے مختار صاحب کے مضامین اچھی طرح سے واضح ہو جائیں گے اور ان کے اسرار بھی کھل سکیں گے۔

☆

کوئی بدمست سی گھنگھور گھٹا ہو جیسے　　سر پھری سرکش سی مغرور ہوا ہو جیسے
تمکنت ایسی کہ ہر گام پہ فتنے جاگیں　　حسن اس شان سے چلتا ہے خدا ہو جیسے

ہر الم ضامن مسرت ہے　　ان غموں کو یوں مول لیتا ہوں
تم اجالے کی بات کرتے ہو　　میں اندھیرے پہ جان دیتا ہوں

☆

چشمۂ آب حیات کی خاطر　　اک مصیبت مگر اٹھانی تھی
تیرے ہونٹوں کو چوم لیتا وہ　　کیوں سکندر نے خاک چھانی تھی

☆

یہ خوش فہمی ہے یاروں کی بڑا فن کار کہتے ہیں نہیں ہے اس میں سچائی وہ سب بیکار کہتے ہیں
سیاہی پھیرتا رہتا ہوں بس قرطاس ابیض پر بہت مجبور و بے بس ہوں مگر مختارؔ کہتے ہیں

☆

رنگ و انداز دشمنی نہ رہا　　کوئی معیار دوستی نہ رہا
جس کر انسان کہہ سکیں مختارؔ　　وہ حقیقت میں آدمی نہ رہا

آخری قطعہ میں انھوں نے اپنی کسر نفسی کا اظہار کیا ہے۔ظاہر ہے کہ کوئی بھی قلم کار اپنے منھ میاں مٹھو تو بن نہیں سکتا ہے۔ان کے دیگر قطعات جمالیاتی انداز کے ہیں۔یہاں پر یہ بات واضح رہے کہ شعری سفر کے ارتقاء میں ایک ہی قسم کے خیالات کو مختلف اصناف میں پیش کرتے رہے ہیں۔اس کے علاوہ ان قطعات میں مناظر فطرت کی جھلکیاں بھی ملیں گی تو تجربات اور مشاہدات کے جلوے بھی ہیں۔تو اسی کے ساتھ حب الوطنی کے جذبات بھی انگڑائیاں لیتے دکھائی دیں گے اور خدائے پاک کی عظمتوں کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کی عقیدتوں کی جلوہ سامانیاں بھی سرور و کیف سے سرشار کریں گی۔اس ضمن میں ان کے کچھ مختلف النوع قطعات درج ذیل ہیں:۔

(الف)　　حمدیہ قطعات :۔

شب سیاہ سے سورج نکالتا ہے وہ　　ہر اک ذرے سے زمیں کو اجالتا ہے وہ
سنا یہی ہے ہژدہ ہزار عالم میں　　سبھی جہانوں کی مخلوق پالتا ہے وہ

☆

گرچہ میں گنہ گار خطا کار بہت ہوں　　دنیا کے علائق میں گرفتار بہت ہوں
رحمت پہ بھروسہ ہے مجھے خلد ملے گی　　حالانکہ جہنم کا سزاوار بہت ہوں
تیرنگہ حسن سے گھائل ہو جا　　فطرت کے نظاروں پہ بھی مائل ہو جا
دنیا سے یہ رغبت تو بجا ہے لیکن　　اللہ کی قدرت کا بھی قائل ہو جا

(ب)　نعتیہ قطعات:۔

سب رسولوں سے جو بڑا بھی ہو　جو نبوت کی انتہا بھی ہو
اس کو بندے بھی کیوں نہ چاہیں　　جو کہ محبوب کبریاء بھی ہو

☆

کیا بگاڑے گی گردش دوراں　　کیا زمانہ مجھے ستائے گا
نام لیوا ہوں میں محمد کا　　وقت مجھ کو نہ میٹ پائے گا

☆

آگے جبریل کا نہ پر جائے　　وہ بھی تھک جائے گر نظر آئے
اس کی عظمت کیا ٹھکانہ ہو　　حد امکاں سے جو گزر جائے

☆

دل کا کھلنا ہے بس محمد سے　　زخم سلنا ہے بس محمد سے
یہ خدا پہ تو مل نہیں سکتے　　لب کا ملنا ہے بس محمد سے

(ج)　عاشقانہ قطعات:۔

غم کی راتوں میں جشن ہوتا ہے　　تیرگی سے اجالے ڈھلتے ہیں
میرے دل کے سیاہ خانے میں　　تیری یادوں کے دیپ جلتے ہیں

☆

کانٹے کانٹے کو تازگی دیں گے　　ذرے ذرے کو روشنی دیں گے
ہم ہیں مختارؔ اس گلستاں کے　　اس کی ہر شئی کو زندگی دیں گے

☆

عالم رنج بپا ہو تو غزل ہوتی ہے　　دل بھی مصروف بکا ہو تو غزل ہوتی ہے
شدت غم سے ہی اشعار جنم لیتے ہیں　　درد جب حد سے سوا ہو تو غزل ہوتی ہے

☆

اس کرہ ہستی پہ نمائندہ رہا ہوں　　تاریخ کی پیشانی پہ تابندہ رہا ہوں
فن کار ہوں مجھ سے متعارف ہے زمانہ　　میں وہ ہوں کہ ہر دور میں پائندہ رہا ہوں

(د)　قومی قطعات :۔

یہ آزادی جسے نسبت ہے ہر ہندو مسلماں سے　　یہ آزادی عبارت ہے سب کے دین و ایماں سے
یہ آزادی کہ جس نے دیش کو جمہوریت بخشی　　لکھی ہے داستان اس کی فقط خون شہیداں سے

☆

سرفروشان وطن بڑھتے رہو بڑھتے رہو　　باندھ لو سر سے کفن بڑھتے رہو بڑھتے رہو
ہو مجاہد صف شکن بڑھتے رہو بڑھتے رہو　　اے جوانان وطن بڑھتے رہو بڑھتے رہو

(د)　واقعاتی قطعات :۔　بر وفات خلیق ٹونکی

اس طرح کی موت ہوگی یہ کبھی سوچا نہ تھا　　ہم نے تیرے مرتبے کو آج تک سمجھا نہ تھا
بعد یہ مردن یہ حقیقت ہم پہ روشن ہوگئی　　فی الحقیقت خوشنویسی میں کوئی تجھ سا نہ تھا
فن جو تیرا مستند ہے اور کتابت محتشم　　زیب دیتا ہے کہ تجھ کو میں کہوں زریں قلم
بھول جائے یہ زمان یہ کبھی ممکن نہیں　　مر کے بھی زندہ رہے گا تو بھی اور تیرا قلم

(بحوالہ کتاب نما اگست ۱۹۹۴ء)

برموقع اجرائے کتاب ''جستجو''

مرحبا اس جستجو پر مرحبا　　مرحبا صدمرحبا اورحبذا

لب پہ ہے مختؔار کے یہ ہی دعا　　کاش جاری رکھ سکو یہ سلسلہ

برموقع ترجمہ امیر نامہ:۔

بساون لال شاداںؔ نے جو تھا لکھا　　اسے بھی منتقل ہندی میں کر ڈالا

ریاض الدین تیرا کام یہ ہے　　بہت عمدہ۔ بہت بہتر، بہت اچھا

(بحوالہ کتابچہ؛جستجو؛ مشاہیر کی نظر میں)

﴿ مختار ٹونکی کی گیت نگاری ﴾

گیت بیسویں صدی سے ہی اردو شاعری کے ایک مستقل صنف کے طور پر جانی جاتی ہے اور یہاں پر گیت جذبات، احساس اور مناسب الفاظ کے ساتھ قلم بند کئے جاتے ہیں۔جن کے اندر جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے یہ گیت عام فہم اور عام زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ڈاکٹر قیصر جہاں کے الفاظ میں:

''گیت شاعری کی اولین صنف ہے۔ یہ قدیم ترین دور کے انسان کے بے اختیار اور شدید جذبات کا غنائی اظہار ہے۔ یہ جذبہ کی زبان ہے اس لیے اس میں صناعی اور پرکاری کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ زیادہ بناوٹ اور بناؤ سنگھار گیت کے حسن میں اضافے کے بجائے اس کو بوجھل بنا دیتی ہے۔''

نیز وہ آگے بھی لکھتی ہیں کہ:

''یہ نہایت ہی شخصی اور داخلی صنف ہے اس میں ایک موڈ، ایک خیال اور ایک جذبے کا بیان ہوتا ہے۔ جذبے کی یک رنگی دل پر ایک بھرپور نقش چھوڑتی ہے اور اس کی نغمگی پڑھنے والے پر ایک کیفیت طاری کر دیتی ہے'' ۵؎

اردو گیتوں کے اولین نمونے ہم کو حضرت امیر خسرو کے ریختہ کلام میں ملتے ہیں جن کا وقت آدی کال

کا ہے۔ یہ ریختہ گیت ہی مانے جاتے تھے۔ان گیتوں میں ہندی، سنسکرت، عربی ورفارسی کے الفاظ بھی شامل تھے۔امیر خسرو کے علاوہ اردو ادب میں ایک اور صوفی شاعر حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے یہاں پر بھی گیتوں کی جھلک نظر آتی ہے۔

دکن میں اردو گیتوں کو خاص توجہ دی گئی، قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، وجہی، غواصی، علی عادل شاہ شاہ ثانی، جانم، سید میراں ہاشمی وغیرہ کے تخلیق کئے ہوئے گیتوں میں نسوانی لب ولہجہ موجود ہے۔

شمالی ہند میں افضل کے بارہ ماسہ گیت میں قدرتی رنگ نظر آتا ہے۔اس دور کے گیتوں میں عربی فارسی اور ہندی کے الفاظ کا زیادہ استعمال ملتا ہے۔اسی تصنع اور بناوٹ کے دور میں نظیر اکبرآبادی منظر عام پر آتے

ہیں۔جن کے گیتوں میں سادہ اور سلیس الفاظ میں ہندوستانی رنگ میں گیت ملتے ہیں۔گیت کی مکمل شکل مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے گیتوں میں بھی نظر آتی ہے۔جن میں غدر کے درد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

انیسویں صدی میں انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر بھی پڑے تو شاعری نے حقیقت نگاری کی جگہ لی۔جس کی وجہ سے شاعری میں جذبات، احساسات، اور داخلیت کی طرف توجہ کی جانے لگی۔حالی، آزاد، اسماعیل میرٹھی، چکبست اور سرور جہاں آبادی کی نظموں میں گیت کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔اردو گیت نگاری کو فروغ دینے والوں میں حفیظ جالندھری، وامق جون پوری، مضطر خیرآبادی، حسرت موہانی اختر شیرانی اور قتیل شفائی کے نام قابل ذکر ہیں۔

صوبائی سطح پر شہرت یافتہ گیت نگار مختار ٹونکی ہیں۔جنھوں نے اس صنف میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔ وہ اس صنف کی تعریف میں اپنی تصنیف ''فکر پارہ پارہ'' میں کہتے ہیں کہ:

> ''گیت جذبات اور احساسات کی منھ بولتی تصویریں ہوتے ہیں۔ان تصویروں کے رنگ روپ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔کیونکہ گیتوں کی خارجی شکل تغیر پذیر ہے باوجودیکہ داخلی کیفیت مستقل اور پائیدار ہوتی ہے۔اچھے گیت دل ودماغ

پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں احساسات کو کیف وانبساط بخشتے ہیں عوام کے
مزاج اور اوصاف کی تعمیر کرتے ہیں، ماضی کی قدروں کو محفوظ رکھتے ہیں، تہذیب
اور ثقافت کا سرمایہ بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گیتوں کی دنیا رنگا رنگ ہوتی ہے۔
یہ مختلف انداز کے ہوتے ہیں اور مختلف طریقوں سے گائے جاتے ہیں اور مختلف
مواقع پر مختلف نوعیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ۶

آپ گیت نگاری میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ راجستھان کے مقبول ومشہور یومیہ اخبار ''راجستھان پتریکا'' نے ۱۹۹۱ء میں ایک کل ہند گیت نگاری کی مقابلہ ''آؤ گیت لکھیں'' کے عنوان سے منعقد کیا تھا۔ جس میں اردو ہندی کے چھ سو بارہ گیت نگاروں نے حصہ لیا تھا اور ۱۲۳۰ گیت پیش ہوئے تھے۔ ان میں سے ۲۱۱ شعراء اور ۴۰۴ گیتوں کا انتخاب ہوا تھا۔ متفقہ طور پر پانچ ججوں نے مختار صاحب کے گیت ''پربودھ گیت'' کو ترجیح دی اور اول انعام سے نوازہ۔

مختارؔ ٹونکی کے گیت قومیت اور وطنیت کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان کے گیت ''پربودھ گیت'' پر ان کو انعام سے نوازہ گیا تھا۔ جوان ے کے وطنیت کے جذبے کا اظہار ہے اس کے بند ملاحظہ ہوں:

ابھی آگے بڑھنا مناسب نہیں کچھ
ابھی راستوں میں اندھیرے بہت ہیں
ابھی ہر قدم پر ہیں خطرے ہزاروں
ابھی ہر قدم پر لٹیرے بہت ہیں
سفر کرنے والے نہ آواز دے تو، مسافر کی کوئی بھی قیمت نہیں ہے
یہ کس نے کہاں سے پکارا مجھے
ابھی تک وطن کی فضا تک نہ بدلی
ابھی تک ہے ماحول بگڑا ہوا سا

ابھی تک اس میں بہاریں نہ آئیں

ابھی تک چمن بھی ہے اجڑا ہوا سا

اگر پھول سونگھو تو خوشبو نہیں ہے ،اگر ان کو دیکھو تو رنگت نہیں ہے

یہ کس نے کہاں سے پکارا مجھے

قومی جذبات کے علاوہ ان کے یہاں پر عشقیہ خیالات اور رومانی تصور خوب جلوہ گر ہیں موصوف نے اپنے گیتوں میں اپنے محبوب کی تعریف نہایت ہی پاکیزہ اور خوبصورت انداز میں کی ہے:۔

دست قدرت کا اک نظارا ہو

حسن فطرت کا اک اشارا ہو

ماہ پیکر ہو، ماہ پارہا ہو

مرے جیون کا اک سہارا ہو

میری قسمت کا تم ستارا ہو

تم سے لطف حیات باقی ہے

چاند تاروں میں روشنی ہو تم

ان بہاروں کی تازگی ہو تم

سب نظاروں کی دلکشی ہو تم

سب نظاروں کا اک نظارا ہو

میری قسمت کا تم ستارا ہو

تم سے لطف حیات باقی ہے

رومانی مزاج اور جمالیاتی رجحان کے ساتھ مختار ٹونکی کے گیتوں میں درد وغم بھی ہیں اور جوش وخروش بھی ہے۔ حوصلہ مندی کے جذبات کے ساتھ زندگی کے مختلف رنگ میں موجود ہے۔زندگی کے مختلف رنگوں کی ترجمانی

کرتا ان کے گیت کا یہ بند:

کہیں رگ گلاب ہوں　　کہیں شرار سنگ ہوں
کہیں میں نالہ و فغاں　　کہیں رباب وچنگ ہوں
کہیں ہوں کوہ و دشت میں　　کہیں ہوں درس گاہ میں
کہیں ہوں بزم عیش میں　　کہیں ہوں رزم گاہ میں
کہیں فساد و فتنہ ہوں　　کہیں ہوں امن و شانتی
میں زندگی ہوں زندگی

مختار صاحب نے اپنے گیتوں میں مشکل پسندی سے پرہیز کیا ہے۔انھوں نے سادہ عام فہم اور پر لطف زبان کا استعمال کیا ہے۔ان کے یہاں پر الفاظ کا صوتی آہنگ قاری کی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔لفظوں کی نغمگی اور ان کی تکرار سے گیت کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے:۔

رکے نہیں یہ کارواں بڑھے چلو، بڑھے چلو
بہادرو! رواں دواں بڑھے چلو، بڑھے چلو
بڑھو گے آگے تم اگر
نظر میں بھر کے حوصلے
سپاہیانہ شان سے
کرو گے طے جو مرحلے
ہیں منزلیں دھواں دھواں بڑھے چلو بڑھے چلو
بہادرو! رواں دواں بڑھے چلو بڑھے چلو

بڑھے چلو بڑھے چلو اور رواں دواں جیسے الفاظ سے ذہن میں کیفیت چھا جاتی ہے۔موصوف نے ان مصرعوں سے گیت میں موسیقیت اور ترنم میں اضافہ کیا ہے۔ایک دوسرا گیت کا بند ملاحظہ ہو:۔

نسیم خوشگوار ہے　　فضا بھی کیف بار ہے
زمین سے آسمان تک　　بہار ہی بہار ہے
مگر دل حزیں مرا　　بہت ہی بے قرار ہے
کسی کا انتظار ہے

الفاظ کے انتخاب میں مختارؔ ٹونکی کو قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے ہندی الفاظ کو اپنے گیتوں میں اس طرح سمویا ہے کہ زبان بوجھل نہیں لگتی بلکہ موثر اور فطری معلوم ہوتی ہے۔

ایسی بھی نراشا کیا یارو
یہ رات تو غم کی جائے گی
آکاش پہ اوشا ابھرے گی
پھر صبح سہانی آئے گی

پھر جوت جلے گی آشا کی　　پھر سپنے سجیں گے پلکوں پر
پھر اندھیارے مسکائیں گے　　آنکھوں میں فسانے جاگیں گے
شرما کے اماوس جاگے گی　　ہر بات خوشی بن جائے گی
ہاں صبح سہانی آئے گی
ہاں صبح سہانی آئے گی

موصوف کے گیت میں جذبات اور احساسات کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایک شاعر نہ صرف اپنے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ اپنے دور کی آئینہ داری بھی کرتا ہے۔ مختار صاحب کے یہاں پر حقیقی زندگی کی جھلک ملتی ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں نظم کی طرح ایک موضوع لے کر چلتے ہیں اور بڑے ہی موثر پیرائے میں اپنے خیالات و جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ کسی ایک بند سے کسی بھی گیت کی حقیقی نوعیت ظاہر نہیں ہوتی ہے بلکہ اور گیت کو پڑھ کر اور اس کو گنگنا کر ہی لطف لیا جا سکتا ہے۔ ان کے گیت خالص ادبی رنگ

میں ہیں اوران کے احساس کا آئینہ ہیں۔

﴿ اردو میں دوہا نگاری ﴾

دوہا ہندوستان کی تہذیب کی وراثت ہے۔اور یہ ہندی زبان کی قدیم ترین صنف ہے۔جو اپنی فنی خصوصیات اور کلاسیکی انداز کی وجہ سے عوام میں مقبول صنف ہے۔اردو کے ابتدائی دور سے ہی دوہا نگاری کے نقش ملتے ہیں۔ابتداء میں اس کو سادھوسنتوں اور صوفیوں نے اپنایا۔بھگتی آندلن کا زور دوہا نگاری کے عروج کا دور تھا۔دوہا نگاری کی ہیئت وروایت ہر دور میں رہی ہے۔فریدالدینؒ گنج شکر،حمیدالدین ناگوریؒ، برہان الدین جانمؒ، ملا وجہیؒ، امیر خسروؒ، میر جعفرزٹلیؒ،انشاءؒ، مصحفیؒ نے دوہا گوئی کے ذریعہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچایا ہے۔

دوہا ہندی زبان کی مقبول ترین صنف ہےاوراس کا تعلق قدیم اپ بھرنش زبان سے ہے۔اردو گیت کے بعداس میں دوہا ہندی زبان کی ہی دین ہے۔اگر چہ یہ گیت کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص فارم میں تخلیق کیا جاتا ہے۔

دوہا دومصرعوں پر مشتمل ایک نظم ہے۔اس کو قدیم زمانے میں ’’دوہک‘‘اور’’دیپ تھیک‘‘ کے نام سے جانا جاتا تھا۔اس کا ہرمصرعہ دوحصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔جس کے پہلے حصے میں تیرہ ماترائیں اور دوسرے حصے میں گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں اوران چوبیس ماتراؤں کا دونوں مصرعوں میں ہونا ضروری ہے۔اوزان کے علاوہ دوہا کی تخلیق میں نغمگی اور موسیقی کے لیے ایک مخصوص آہنگ ہوتا ہے اور یہ آہنگ ذہن کو متاثر کرتا ہے۔دوہوں کے دونوں مصرعوں کے درمیان وقفہ ہونا لازمی ہے۔اس کے علاوہ ہند چھند شاستر سے آگاہی دوہا نگاری کی شرط ہے۔دوہا کے وزن ماتراؤں اور آہنگ کو لے کر دوہا کی تعریف فراز حامدی کے اس دوہے سے واضح ہوتی ہے:۔

تیرہ گیارہ ماترا بیچ بیچ وشرام
دومصرعوں کی شاعری دوہا جس کا نام ؎

اردو کی دیگر اصناف کی طرح سے دوہا نگاری پر بھی کام ہوا ہے اور کچھ شعراء نے اس پر طبع آزمائی کی ہے ان میں سے ایک مختار ٹونکی بھی ہیں جو کہ شاید انھوں نے ضرورتاً کہے ہیں ۔انھوں نے ایک دوہے میں برہن کے جذبات کا اظہار کیا ہے اس دوہے میں موصوف نے قدیم انداز کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔انھوں نے عورت کے جذبہ واحساس کا بیان اس کے ہی لب و لہجے میں کیا ہے جس کا شوہر دوسرے ملک میں کمانے کے لیے گیا ہے جو اپنے شوہر سے جدائی کی کیفیت گیت کے ذریعہ بیان کرتی ہے کہ

کیسے تم سے کہوں آتی ہے مجھ کو لاج کتنے دن میں آؤ گے بولونا! سرتاج
حاصل ہونگی راحتیں سدھرے گا سب حال رہنا ہوگا ٹھاٹھ سے کیسا آٹا دال
ڈھیروں دولت لاؤ گے ہوں گے مالا مال لیکن وعدہ تھا کیا آؤ گے ہر سال
جسے سے صدیاں ہوگئیں مجھ کو لگتا ہے آج
کتنے دن میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ان کے دوہے ویسے تو جذبات اور احساسات کے سمندر ہیں لیکن دوہے کے عروضی نظام کی وجہ سے ان میں غنائیت پیدا ہوگئی ہے کیونکہ دوہا صنف خود موسیقی پر منحصر ہے ۔

﴿ مختار ٹونکی کی دوہا نگاری ﴾

مختار صاحب کے دوہے مکمل طور پر دوہا نگاری کے اصول پر کھرے اترتے ہیں ۔انھوں نے دوہوں کے ماتراؤں کے ساتھ ان کے اوزان کا بھی خیال رکھا ہے ۔وہ اپنے خیالات کو مناسب اور موزوں الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔دوہوں میں کیف وسرور کے ساتھ ہم آہنگی ہے ۔الفاظ سادہ اور سلیس ہیں ۔لہجہ صاف اور بندش چست ہے ۔ان کے دوہوں میں جذبات کی صداقت کے ساتھ احساس کی ندرت اور اخلاقیات کی نصیحت ہے ۔ذیل میں ان کے چند دوہے بطور مثال پیش ہیں :۔

سائیں سب کا میت ہے، سب کے ناز اٹھائے
جو اس کا نام نہ لے وہ بھی روزی پائے

☆

سائیں سب کا ایک ہے گرچہ نام انیک
بندے ست کی ٹیک پر، اپنا ماتھا ٹیک
جو بندہ دھن پت ہے دونوں ہاتھ لٹائے
سب تو کہہ دیں کھودیا دونا ہوتا جائے

☆

دنیا مایا جال ہے اس میں جو پھنس جائے
اپنوں سے منھ موڑ کر غیروں کو اپنائے

مختار صاحب نے ان دوہوں میں حقیقت کا اظہار ملتا ہے۔ رومانی تصور میں وہ اپنے دوہوں کا جال بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ بنتے ہیں۔عشقیہ کیفیت سے پر ان کے کچھ دوہے درج ہیں؛۔

گوری تیرے روپ میں، چندا جیسا نور
درشن تیرے جو کرے، ہو جائے مسرور

☆

پیڑا نے لی انگڑائی لی، بہہ نکلے جب نیر
آنکھوں اندر سج گئی ، ساجن کی تصویر

☆

پریوں جیسا روپ ہے آنکھیں مقناطیس
گوری جائے جس طرف کھنچ جائیں دس بیس

☆

اسی طرح سے انھوں نے دوہا کی تعریف میں یہ ودہا کہا ہے کہ

لکھو جی بھر کر لکھو کہتا ہے مختارؔ

تیرہ گیارہ ماترا، دوہوں کا سنسار

﴿ مردف دوہے ﴾

قافیہ کے ساتھ ردیف کا بھی جس دوہے میں استعمال ہو وہ مردف دوہے کہلاتے ہیں۔ جو کہ مقفع ہوتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کے التزام کے ساتھ ان میں موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مختار صاحب نے مردف دوہے کہے ہیں جو کہ دوہا گوئی میں ایک اضافہ ہیں۔ کیونکہ قدیم دوہا گو شعراء نے مردف دوہے نہیں کہے ہیں۔ بطور نمونہ چند دوہے درج ذیل ہیں:۔

آدر، عزت مت گھٹا، ہانی ہو کہ لابھ

اپنے سر کو مت جھکا، ہانی ہو کہ لابھ

☆

جب بھی چاہے رو دیئے کیسے ہیں یہ لوگ

سچے موتی کھو دیئے کیسے ہیں یہ لوگ

☆

دل کو روشن کر لیا کے، لے کر تیرا نام

سکھ سے دامن بھر لیا، لے کے تیرا نام

☆

تھوڑی سی ہے زندگی، مانو میری بات

کر لو جی بھر عاشقی مانو میری بات

﴿ دوہا غزلیں ﴾

دوہا اور غزل کی آمیزش سے ایک نئی شعری صنف دوہا غزل تخلیق ہوئی۔ عروضی لحاظ سے اس صنف میں دوہا اور غزل دونوں کے اصول وضوابط کا التزام ہوتا ہے۔ دوہا غزل میں دوہا کے اوزان ۲۴ = ۱۱+۱۳

ماترائیں ہوتی ہیں۔اس میں غزل ہی کی طرح سے ایک مطلع ہوتا ہے اور مطلع کے بعد دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔جس کا پہلا مصرعہ غیر مقفیٰ اور دوسرا مقفیٰ ہوتا ہے۔آخر میں اس میں مقطع بھی استعمال ہوتا ہے۔ غزل تو کسی بھی بحر میں کہی جا سکتی ہے لیکن دوہا غزل دوہے کے عروضی ڈھانچے کی پابند ہوتی ہے۔

اردو کے دوہا نگار اہم شعراء نے اس صنف کو مروج کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ڈاکٹر فراز حامدی نے کئی ہیئتی تجربے بھی کئے ان میں دوہا غزل بھی ہے۔فراز حامدی مختار صاحب کے ہم وطن اور ہم محلّہ ہی نہیں ہم پیشہ اور ہم خیال بھی ہیں۔

مختؔار ٹونکی نے دوہا غزل کے قالب میں نبی کریم ﷺ کی نعت کو بڑی نفاست اور پاکیزگی کے ساتھ ڈھالا ہے۔وہ آپؐ کی نعت میں کہتے ہیں کہ:

برتر بالا آپؐ ہیں،رفعت والے آپؐ
چھوٹی ساری عظمتیں،عظمت والے آپؐ

مشفق سب کے مہرباں،شفقت والے آپؐ
سارے جگ کے واسطے رحمت والے آپؐ

مکہ چھوڑا چل دیئے لے کر حق کا نام
حق کی خاطر گھر تجا ہجرت والے آپؐ

نازاں جس پہ کہکشاں،نادم سورج چاند
روشن،دلکش،دل نشیں،صورت والے آپؐ

کنکر بولے شان سے ،چندا تھا دونیم
دیکھا سب نے معجزہ قدرت والے آپؐ

شاعری میں جب عورت کے جذبات اور احساس یا اس صفات کی کی بات کی جاتی ہے تو اس کو مختلف انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔مختؔار ٹونکی نے عورت کی صفات کو دوہا غزل میں اس انداز سے بیان کیا ہے کہ:

شعلہ شبنم ہے یہی، امرت وش کی دھار　　شاخ گل تلوار ہے، جس کو کہتے نار
چاہے دریا ہو چڑھا، طوفاں ہو منجدھار　　کرتی بیڑا پار ہے، جس کو کہتے نار
ناری بن یہ زندگی، جینا ہے دشوار　　جیون کا آدھا ہے، جس کو کہتے نار
دیوی ہے اخلاص کی، الفت کی اوتار　　من مین رکھتی پیار ہے جس کو کہتے نار

﴿مختار ٹونکی کی ہائیکو نگاری﴾

اردو ادب نے روز اول سے ہی دنیا کی مختلف زبانوں کی شعری اصناف و روایت سے فیض حاصل کیا ہے۔ انگریزی، فرانسیسی ادب ہو یا پھر عربی فارسی۔ سبھی زبانوں کی شعری اصناف کو اردو ادب نے اپنایا ہے۔ مثنوی، آزاد نظم، معریٰ نظم، سانیٹ، ترائیلے وغیرہ کی فہرست میں ایک اور صنف کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے ہائیکو۔ ہائیکو ایک جاپانی صنف ادب ہے جو کہ اپنی ملکی حدود سے نکل کر دنیائے ادب میں شہرت اور مقبولیت کے ساتھ ایک مقام بنا چکی ہے۔

ہائیکو تین مصرعوں پر مشتمل صنف ہے جو کہ جاپانی، ثقافتی، روایتی اور شعوری خوبصورتی میں پروان چڑھی ہے۔ یہ صنف جاپان میں نویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان پروان چڑھی۔ اس صنف کو بام عروج پر پہنچانے کے لئے باشو (Basho) کی اہم خدمات رہی ہیں۔ انیسویں صدی میں ہائیکو فلسفۂ حیات میں شمولیت پا کر خوب پھلی پھولی۔

ہائیکو کو ابتدا میں (Hukko) کہا جاتا تھا اور اس لفظ کا جاپانی مصنف ماساؤ کی شیکی (masao kashiki) نے اس کو ہائیکو کا نام دیا۔ یہ صنف جاپانی کلاسیکی جینیر (Gener) کی مختصر سی نظم ٹنکا (Tanka) کا فارم دیا ہے۔ اور اس نظم میں ۵۔۷۔۵۔۷۔۷ صوتی ارکان ہوتے ہیں۔ اس کی ابتداء تین مصرعوں کو ۵۔۷۔۵ جاپانی میں کامی لوکو (Kami-lo-ko) کہتے ہیں جب کہ آخری دو مصرعوں ۷۔۷ کو شیمو نو کو (Shimi-no-ko) کہتے ہیں۔ اس کے ابتدائی تین مصرعے کامی نو کو (Kami-no-ko) کو آزانہ طور پر ہائیکو کی صوت میں استعمال کی گیا ہے۔

اس طرح سے ہائیکو غیر مقفی سطروں والی جاپانی نظم (شاعری) ہے جو کہ محض تین ہی مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔اس کے پہلے مصرعے میں پانچ دوسرے میں سات اور تیسرے میں پانچ صوتی آہنگ ہوتے ہیں۔ کل ۱۷ اسلیبل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون ''اردو میں ہائیکو'' میں ہائیکو کی خصوصیات بیان کرتے ہیں کہ:

(۱) جاپانی ہائیکو کا خاص وزن اور آہنگ مقرر ہے۔جو کم سے کم ارکان پر مشتمل ہوتا ہے یعنی پہلا اور تیسرا مصرعہ پانچ پانچ صوتی آہنگوں اور دوسرا مصرعہ سات آہنگوں کا بنتا ہے اردو میں بحر متقارب سے اس کے وزن کو اس طرح ظاہر کر سکتے ہیں:

فعلن فعلن فع = ۵

فعلن فعلن فعلن فع = ۷

فعلن فعلن فع = ۵

(۲) ہائیکو میں صرف تین مصرعہ ہوتے ہیں اور وہ بھی قافیوں سے آزاد پہلا اور تیسرا مصرعہ باعتبار تعداد آہنگ، یکساں اور مساوی اور تیسرا مصرعہ ان دو مصرعوں سے بقدر دو آہنگ ہوتا ہے۔

(۳) موضوع کے اعتبار سے ہائیکو کا تعلق عموماً مناظر قدرت اور موسموں کی خوش گواری و رومانی طبیعتوں کی جمال پرستانہ امنگوں پر ہوتا ہے۔ [۸]

اردو میں ہائیکو کا آغاز ۱۹۳۶ء سے مانا جاتا ہے۔جس کی ابتداء دہلی میں نورالحسن برلاس کے کہنے پر رسالہ ''ساقی'' کے جاپانی ادب کے نمبر سے ہوئی تھی۔لیکن ۱۹۸۰ء کے بعد جب ہندو پاک کے شعراء نے جاپانی شاعری کی ہیئت اور اصول وضوابط کا مطالعہ کر کے ہائیکو کہے تو دوہوں کی طرح مختصر صنف ہونے کے وجہ سے خاص طور پر پہلے پاکستان میں پھلی پھولی پھر اردو میں اس کو زبردست مقبولیت حاصل کی۔

ہندی میں جہاں ہائیکو نے تیزی سے فروغ حاصل کیا وہیں اردو میں بھی اس میں کئی تجربات کئے گئے۔اردو شعراء نے ہائیکو کے شرائط اور اس کے اصول وضوابط کو مکمل طور پر اپنایا اور اس کے وزن اور آہنگ

کو مدنظر رکھتے ہوئے خوش رنگ ہائیکو کہے۔

اردو میں ہائیکو کے اہم شعراء میں ادا جعفری، حسن اکبر جمیل، پیرزادہ قاسم محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر، سرشار صدیقی، خواجہ رضی حیدر، سلیم کوثر، اقبال حیدر اور مختار ٹونکی کے نام قابل ذکر ہیں۔

مختار ٹونکی نے اس مشرقی جاپانی صنف میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔ جو ان کے فن کی پختگی کا اظہار ہے موصوف نے ہائیکو میں ہر قسم کے موضوعات کو برتا ہے۔ وہ کسی بھی ایک موضوع سے بندھے ہوئے نہیں ہیں حالانکہ ہائیکو ایک مختصر سی صنف ہے۔ جو خاص طور پر فطرت کے موضوعات پر منحصر ہے اور اس میں ہر قسم کے موضوعات کو لانا ایک مشکل امر ہے۔ موصوف نے اپنے گرد و پیش کے ماحول، معاشرت کا ہائیکو میں تعارف کرایا ہے۔ ان کی غزل اور نظموں کی طرح ان کے ہائیکو بھی دل کش ہیں۔ چند ہائیکو مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) اللہ پانی دے
بچے مانگے ان کو بھی
گڑ دھانی دے

(۲) روکھی سوکھی کھا
پھر بھی لازم ہے تجھ کو
ہر بھوکے کی گا

عشقیہ جذبات کو ظاہر کرنے والے ان کے ہائیکو:

(۳) اے میرے محبوب
چندا تاروں سے اجلا
تیرا نکھرا روپ

(۴) شیشہ کیا ہے
میری آنکھوں میں اترا
تیرا چہرہ ہے

(۵) گھر میں رہتا ہوں
باہر فتنے برپا ہیں
ڈر میں رہتا ہوں

(۶) رکھتا ایسی شان
سارے دیشوں سے بہتر
میرا ہندوستان

﴿مختار ٹونکی کے سین ریو﴾

ہائیکو کی ہی طرح سے سین ریو بھی ایک جاپانی صنف سخن ہے۔ جس کی لغوی معنی

(RiverWillow) کے ہیں۔ ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے سین ریو پوری طرح سے ہائیکو سے مشابہ ہے۔ ہائیکو کی طرح س اس میں بھی تین مصرعے ہوتے ہیں۔ سین ریو کے پہلے مصرعے میں پانچ، دوسرے میں سات، اور تیسرے میں پانچ صوتی ارکان ہوتے ہیں اس طرح سے ۱۷ مصرعے ترتیب دیئے جاتے ہیں۔

ہائیکو اور سین ریو میں بحر کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دونوں میں کوئی فرق ہے تو صرف معنی کا اور موضوع کا فرق ہے۔ ہائیکو کا موضوع مناظر فطرت ہے۔ تو سین ریو طنز مزاح کی چاشنی سے لبریز ہے۔

اردو زبان میں شعراء نے اس صنف سخن کو برتا ہے، اردو ادب میں اس کی عمر ابھی محض چھ سال ہی ہے ہندوستان میں سب سے پہلے اس صنف سخن کا تعارف ڈاکٹر اسلم حنیف نے کرایا تھا اور اس کو فروغ دینے والوں میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر فراز حامدی کا نام سرفہرست ہے۔ اردو ادب میں ہزل اور واسوخت کو جو مقام حاصل تھا وہی مقام موجودہ دور میں سین ریو کو حاصل ہے۔

مختار ٹونکی کا خاص میدان طنز و مزاح ہے۔ اسی لیے انھوں نے سین ریو کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی ہے موصوف نے اس صنف کو بے حد سلیقے مندی کے ساتھ برتا ہے۔ انھوں نے طنزیہ انداز میں موثر اور پر لطف سین ریو کہہ کر طنز و مزاح کا حق اپنے سین ریو کے ذریعہ ادا کیا ہے۔

ہمارے معاشرے میں رشوت خوری ایک ایسی برائی ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں اپنی جڑیں جما چکی ہے سماج بغیر رشوت کے نہیں چل سکتا ہے اس پر موصوف نے طنز کیا ہے کہ:

اچھا خاصا ہوں
میری چنتا مت کرنا
رشوت کھاتا ہوں

اس کے بعد ہمارے سیاسی رہنماؤں کی خصلت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

(۱) نیتا کیسا ہو
لوگو بولو زوروں سے

(۲) بولیں ٹن ٹن ہیں
نیتاؤں کا کیا کہنا

لومڑ جیسا ہو　　خالی برتن ہیں

ہمارے اس سماج میں دولت جس کے پاس ہوتی ہے۔ اس کو سماج میں زیادہ عزت ملتی ہے اور کمزوروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دولت کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

عزت بڑھتی ہے
پاکٹ میں پیسہ ہوتو
دنیا جھکتی ہے

مختار ٹونکی کے سین ریو میں بیوی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ جو مرد اپنی بیوی کے آگے جھکے رہتے ہیں یا بھیگی بلی بن کر رہتے ہیں اور ان کی بیویاں ان پر راج کرتی ہیں ان پر اس انداز سے اظہار خیال کیا ہے:

(۱) اجڑی دلی بن　　(۲) اچھی لگتی ہے　　(۳) گھر میں رہتا ہے
بیوی کو خوش رکھنا ہے　　پر بیوی ہو تو سالی　　بیوی ڈائن لگتی ہے
بھیگی بلی بن　　بھدی لگتی ہے　　ڈر میں رہتا ہے

(۴) نوکر بن جا　　(۵) ایک توٹی وی ہے
اور بیوی اگر چاہے تو　　دن بھر جو چیخے چلائے
جوکر بن جا　　دوجے بیوی ہے

تعلیم حاصل کرنے کے بعد آج کا نوجوان بے روزگار ہے۔ انھیں اپنی تعلیم کے مطابق ملازمت نہیں ملتی، نظام تعلیم اور معاشرت پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دنیا ہے ہم دم
ان پڑھ پائے حلوہ تو
بی، اے کھائے غم

﴿ چار بیت ﴾

چار بیت ٹونک کی قدیم ترین لوک صنف ہے جسے چار بیت، چہار بیت یا چار بیتی بھی کہا جا تا ہے۔ جس کا تعلق فوجی نغمہ یا رجز سے ہے۔ ایران، عرب اور افغانستان میں یہ رواج تھا کہ حملہ کرتے وقت فوجیوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے رجز پڑھے جاتے تھے اور فتح کے بعد بڑے جوش وخروش کے ساتھ گاتے تھے۔ چار بیت نہ صرف جنگ کے وقت گائے جاتے تھے بلکہ فرصت کے لمحات میں بھی اپنے جنگی اوصات کو بڑے ہی فخر کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اس طرح چار بیت کی بنیاد عسکری نغموں، جنگی ترانوں اور فخر و ناز سے منظوم رجزیہ کلام پر منحصر ہے۔

ہندوستان پر جب بیرونی حملے ہوئے تو فوجیوں کی قیام گاہ پر اس صنف کا رواج ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں روہیل کھنڈ میں چار بیت پشتو، فارسی، اور اردو زبان میں گائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ رام پور، سنبھل، امروہہ، بھوپال اور ٹونک میں جہاں جہاں پر افغانی فوجوں کا قیام رہا وہاں وہاں پر چار بیت کو فروغ حاصل ہوا۔

مذکورہ ریاستوں کے ضمن میں اگر دیکھا جائے تو ریاست ٹونک میں چار بیت خواص عوام میں بھی مقبول ہوئی۔ اردو میں چار بیت کی ابتداء عبدالکریم نے کی جو افغانی تھے؛ جو پشتو میں چار بیت لکھتے تھے۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں پہلی جنگ لڑنے والے نواب امیر الدولہ بہادر نے ٹونک ریاست قائم کی تو ان کی فرمائش پر چار بیت کے ماہرین کو ٹونک بلایا گیا اور وہاں پر چار بیت کی ابتداء ہوئی۔ نواب امیر خاں سے لے کر نواب ابراہیم خان کے دور تک شعراء نے چار بیت خوب کہیں۔ لیکن نواب اسماعیل علی خاں کا دور چار بیت کا سنہرا دور ہے مانا جاتا ہے۔ اور ریاست ٹونک میں سات سات زبانوں میں چار بیت کہی گئیں جس کو ہفت قلم بھی کہا جاتا ہے۔ [۹]

چار بیت ایک گائی جانے والی صنف ہے۔ جو کہ دف پر گائی جاتی ہے۔ اس کو گاتے وقت جوش وخروش کا مظاہر کیا جاتا ہے، ۔ چار بیت کے فن کو صاحب زادہ شوکت علی خان نے اس طرح بیان کیا ہے کہ:

''چار بیت ابتداء ٹیپ کے مصرعہ یا مستزاد کے ایک مصرعہ اور چار اشعار پر
مشتمل تھی، چار بیت پارٹی کا کوئی ایک فرد، سرے ٹیپ کا مصرعہ کہتا ہے پھر
اس کے ساتھی جوش وخروش سے پنجم سروں میں ترنم کے آخری سر تک اٹھا
اٹھا کر تکرار کرتے۔ اسی میں وہ دف کے ساتھ رقص کرتے، مقابلہ کرتے
اور للکارتے ہیں اور اچھل کود اور ہاتھوں اور آنکھوں سے نرت کرتے ہوئے
طنبلوں کے غلغلے میں جوش وخروش کا اس انداز سے مظاہرہ کرتے ہیں کہ کلام
کلام کی نوعیت کے ساتھ بزم ورزم دونوں کے نقشے منظر عام بن جاتے ہیں'' ۱۰

چار بیت میں پہلا شعر دو مصرعوں کا ہوتا ہے۔ جو کہ ہم ردیف وہم قافیہ ہوتا ہے اس بعد چار بند ہوتے ہیں اور ہر بند چار مصرعہ کا ہوتا ہے۔ راجستھان میں چار بیت کے فن کو عروج عطا کرنے والوں میں نواب سعادتؔ علی خان، جامؔ ٹونکی، اخترؔ شیرانی، عرشؔ اجمیری، بسملؔ سعیدی، جوہرؔ ٹونکی، سلطان محمد خان جوشؔ، حضرت ساحلؔ، مولانا فائزؔ، بصرؔ ٹونکی، شفقؔ ٹونکی، بزمیؔ ٹونکی، حفیظ شوقؔ، اور مختارؔ ٹونکی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے اس صنف کو عروج دیا۔

مختارؔ ٹونکی کے شعری مجموعے میں ۲۵ چار بیت شامل ہیں۔ جو بہت عمدہ اور بلند مرتبہ کی ہیں۔ جن کو ٹونک کی چار بیت پارٹیاں بڑے جوش سے پڑھتی ہیں۔ یہ مختلف رسالوں اور جریدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

موصوف کو چار بیت کے فن میں مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے، مذہبی، عاشقانہ، فلسفیانہ مضامین کو چار بیت میں سمویا ہے۔ ان کی چار بیت کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چار بیت کے ادبی وفنی، بصیرت سے بخوبی واقف ہیں۔ موصوف کے چار بیت کا لب ولہجہ پڑھنے اور سننے والے دونوں کے اندر جوش وخروش بھر دیتا ہے۔

مختارؔ ٹونکی کی چار بیت اس کی ہیئت اور چار بندوں سے آراستہ کیا ہے۔ ان کے یہاں پر ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے غزل کا رنگ وآہنگ موجود ہے اور موضوع کلام میں تسلسل ہے ایک بند ملاحظہ ہو:۔

چمن میں آؤ گے پھولوں سے تم کو تولیں گے
تمہارے واسطے شبنم کے مورتی رولیں گے
تمہیں کو دیکھ گلستان کے پھول مہکیں گے
تمہیں کو دیکھ عنادل بھی خوب چہکیں گے
تمہیں کو دیکھ سبھی لالہ زار مہکیں گے
تمہیں کو دیکھ یہ غنچے بھی آنکھ کھولیں گے

دائی حلیمہ ان خوش نصیب شخصیات میں سے ہیں۔ جن کو اللہ نے ایسی سوغات دی تھی کہ ان کو سرور کائنات کو اپنی گود میں کھلانے کا موقع ملا۔ اس کا ذکر وہ کتنے مقدس طریقے سے کرتے ہیں کہ:

دیکھو! کھلا ہے پھول حلیمہؓ کی گود میں ننھا سا ہے رسولؐ حلیمہؓ کی گود میں
کیسا حسین چاند کا ٹکڑا ہے دوستو!
یہ آمنہ کی آنکھ کا تارا ہے دوستو
رخ پہ نثار برق تجلی ہے دوستو
ہے حسن کا نزول حلیمہؓ کی گود میں
یٰس طٰہٰ آپؐ ہیں اور مصطفیٰ ہیں آپؐ
ہیں لاڈلے جہاں کے حبیبؐ خدا ہیں آپؐ
دیکھو تو کیسی شان سے جلوہ نما ہیں آپؐ
جیسے پڑا ہو پھول حلیمہؓ کی گود میں

موصوف نے عشق مجازی پر حسن و ادا کے پیرائے میں بڑے لطیف انداز میں چار بیت کہی ہیں۔ جن میں محبوب کے گیتوں اور لبوں کی تعریف ہے، تو کہیں ہجر و وصال اور دل کی پریشانیوں کا ذکر ہے، تو کہیں پر ان کے جذبات کی شدت کے ساتھ محبوب سے محبت کا اظہار ہے، تو کہیں پر دل کے ٹوٹ جانے کی کیفیت ہے

محبت میں دل کے ٹوٹ جانے کی کیفیت کو بیان کرتی یہ چار بیت :۔

جب کسی کا فرحسیں پہ ٹوٹ کے آتا ہے دل
ساری دنیا کے لبوں پر سرخیاں پاتا ہے دل
دل کا دینا، دل کا لینا، دل ملانا ہے جدا
دل میں رہنا، دل کو کھونا، دل چرانا ہے جدا
جیت لینا دل کسی کا، دل دکھانا ہے جدا
عشق میں ہوتا ہے ایسا ٹوٹ بھی جاتا ہے دل

یہ کبھی آباد اور برباد ہوتا ہے کبھی
یہ گھڑی بھر شاد اور ناشاد ہوتا ہے کبھی
مطمئین بھی مائل فریاد ہوتا ہے کبھی
رنگ بھی شادی غمی کے خوب دکھلاتا ہے دل

عشق حقیقی اور عشق مجازی کے جذبات کے ساتھ ان کی چار بیت قومی جذبات سے بھر پور ہیں ۔ اپنی حب الوطنی کا جذبہ بیان کرتے ہوئے ان چار بیت میں ہندو، مسلم اتحاد کا پیغام دیا ہے ۔ بھارت کسی ایک مذہب کا ماننے والا ملک نہیں ہے ۔ یہاں پر سب ہی مذہب کے ماننے والے برابر ہیں ۔ دیش پر جان دینے والا نہ ہندو ہے اور نہ مسلمان وہ تو ایک ہندوستانی ہے اس کا اعلان وہ ببانگ دہل کرتے ہیں ۔

میں ہوں فرزند بھارت کا، میں ہوں سنتان بھارت کی
مجھ ہی سے شان قائم ہے عظیم الشان بھارت کی
کہیں ارجنؔ ہوں، گوتمؔ ہوں، زمانہ مجھ سے واقف ہے
کہیں حیدرؔ ہوں، بیرمؔ ہوں زمانہ مجھ سے واقف ہے
کہیں شعلہ ہوں شبنم ہوں زمانہ مجھ سے واقف ہے

کہیں میں پھول ہوں ترشول ہوں کرپان بھارت کی
بھگت سنگھ نام ہے میرا مجھے ٹیپو بھی کہتے ہیں
مجھے اشفاق کہہ ڈالو مگرنہرو بھی کہتے ہیں
کوئی پرتاپ کہتا ہےکہیں باپو بھی کہتے ہیں
مجھے پہچان لو لوگو !میں ہوں پہچان بھارت کی

﴿ مختار ٹونکی کی ماہیا نگاری ﴾

ماہیا لفظ ''ماہی'' سے بنا ہے اور پنجاب میں مہیں بھینس کو کہتے ہیں اور اس کے چرواہے کو ماہی کہا جاتا ہے۔ یہ چرواہے اپنا وقت گزارنے کے لئے خالی اوقات میں گیت گایا کرتے تھے۔

ماہیئے پنجاب کی عوامی صنف ہے جس میں عوام کے جذبے، حساسات اور خیالات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ یہ عوامی گیت انفرادیت کے ساتھ اجتماعی زندگی کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔ ماہیوں میں ریختی کا انداز نمایاں طور پر نظر آتا ہے کیوں کہ اس میں عورت کی زبانی مرد سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس میں صرف عورتوں کے جذبات ہی کی ترجمانی نہیں ہوتی ہے بلکہ مردوں کے جذبات بھی ان ہی کی زبان میں بیان کئے جاتے ہیں۔

اردو میں ماہیہ نگاری کی بنیاد ہمت رائے شرما نے رکھی۔ تو ساحر لدھیانوی، قمر جلال آبادی اور قتیل شفائی کا نام اردو ماہیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ چراغ حسن حسرت اور اختر شیرانی نے بھی عمدہ ماہیے لکھے ہیں۔ ساحر لدھیانوی، قمر جلال آبادی اور ہمت رائے شرما فلمی نغمہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں اور تینوں کا ہی تعلق پنجاب سے تھا۔ اس لئے انھوں نے گیت نما ماہیے لکھے جو بعد میں فلمی گیت نگاری میں ڈھل گئے جس کی وجہ سے ان کے ماہیوں (گیتوں) میں غنائیت اور محبت موجود ہے۔

اردو میں ماہیہ نگاری میں وہی وزن استعمال ہوتا ہے۔ جو پنجابی ماہیے میں ہے۔ پنجاب میں ماہیے مساوی مصارع پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جن میں درمیانی مصرعہ کچھ کم اور کچھ زیادہ نظر آتا ہے۔ لیکن ماہیہ کے صحیح

وزن ان ہی شعراء کے یہاں پر ملیں گے جو لوک گیت نگاری سے وابستہ ہیں۔ مساوی مصارع گیت چراغ حسن حسرت کے ماہیوں میں ملتے ہیں مناظر عاشق ہرگانوی نے ہمت رائے شرما کے ماہیوں درست مانا ہے۔

راجستھان میں ماہیہ نگاری کی بنیاد ڈاکٹر فراز حامدی نے ڈالی جو اس صنف کے ابتداء سے ہی گرویدہ رہے ہیں۔ راجستھان کے دوسرے ماہیہ نگار نذیر فتح پوری اور ان کے بعد مختار ٹونکی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ انھوں نے صدہا ماہیہ لکھے اور ان پر متعدد مضامین بھی لکھے ہیں۔ اس صنف سے ان کی دلچسپی اور رجحان کا اندازاہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا ماہیوں کا مجموعہ ''صدرنگ ماہیئے'' کے عنوان سے ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ جس کو ڈاکٹر فراز حامدی نے مرتب کیا ہے۔ اس بابت ڈاکٹر حامدی کہتے ہیں:

> ''مختار ٹونکی کے ماہیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تمام ماہیوں کی تخلیق وتشکیل درست وزن اور مسلمہ ہیئت ''مفعول مفاعیلن/فعل مفاعیلن/ مفعول مفاعیلن'' کے تحت کی ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ زیادہ تر ماہیہ نگار شعراء اسی عروض شناخت میں اپنے زور قلم صرف کررہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ ماہیہ گوئی میں طرۂ امتیاز رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنے ماہیوں کی جھلملاتی کہکشاں سے آسمان شاعری کی وقار واعتبار بخشا ہے اور اس مختصر سہ مصرعی صنف سخن میں جذبہ وخیال اور مواد موضوع کو بلندیاں بخشی ہیں'' [۱۱]

مختار ٹونکی کے ماہیے فنی اور فکری لطافتوں سے آراستہ ہیں۔ انھوں نے اپنے مجموعے میں حمدیہ، نعتیہ، عشقیہ، حزنیہ، فرحیہ، فکریہ، طنزیہ، پندیہ، ہجریہ اور مزاحیہ موضوعات پر ماہیے قلم بند کئے ہیں۔ ان کے اس مجموعے کو ایک خوش رنگ گل دستہ کہا جاسکتا ہے۔ جس کے قسم قسم کے پھول اپنی دلکشی کی وجہ سے اپنی طرف متوجہ کرہی لیتے ہیں۔

ڈاکٹر فراز حامدی موصوف کے ماہیہ نگاری پر ان کے اسی مجموعے میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''مختار ٹونکی کے ماہیوں کا مجموعہ بھی حسین وجمیل پھولوں کا ایسا چمنستان ہے

جس میں انھوں نے مشام جاں کو معطر کرنے کے لیے صدرنگ موضوعات کی پود لگائی ہے اور پنجاب کی پانچ ندیوں کے پانی سے اس کی آبیاری کی ہے، اسی لئے انھوں نے خود ہی کہا ہے کہ:

پنجاب کی دھرتی ہے

ماہیہ پھوٹا ہے

اک خواب کی دھرتی سے [۱۲]

مختار ٹونکی کے حمدیہ اور نعتیہ ماہیوں میں رب العالمین کی شان اور رحمت اللعالمین کی توصیف بیان کی گئی ہے۔ عشقیہ ماہیوں میں انھوں نے خوبصورت تشبیہات سے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف بڑے حسین پیرائے میں کی ہے۔ تو محبت میں درد و غم اور ہجر و فراق کی کیفیات کو بھی ظاہر کیا ہے۔

حمدیہ ماہیے

دل اس پر فدا ہے تو — پھول میں غنچے میں

غیر سے کیا لینا — عکس تیرا دیکھوں

جب ایک خدا ہے تو — خورشید میں ذرے میں

نعتیہ ماہیے

آفاق میں ان جیسا — محبوب بھی رب کے ہیں

ڈھونڈھ نہ پاؤ گے — نور سراپا ہیں

اخلاق میں ان جیسا — وہ چاند عرب کے ہیں

عشقیہ ماہیے

مئے نوش بنایا ہے — گلنار سی صورت ہے

آنکھ گلابی ہے — ہونٹ گلابی ہیں

مدہوش بنایا ہے　　کیا خوب صباحت ہے

حزنیہ ماہیے

آکاش میں تارے ہیں　　مٹھی میں نہیں جگنو

درد کہے ہم سے　　جاؤں کدھر اب میں

یہ اشک ہمارے ہیں　　اندھیارا ہوا ہر سو

موصوف کے ماہیوں میں ایک طرف زندگی کے درد وغم کا اظہار ہے تو دوسری جانب غم ومسرت کا ملا جلا اظہار بھی دیکھنے کو ملتا ہے جس میں ملاقات کی چاہت کے ساتھ جدائی کا غم بھی ہے۔ان کے ماہیے فکر واحساس کی شگفتگی لئے ہوئے ہیں تو پند ونصیحت کے ساتھ طنز ومزاح کی چاشنی میں بھی ڈوبے ہوئے ہیں۔

فرحیہ ماہیے

ایک پھول چنبیلی کا　　جب دیپ جلائیں گے

نقش لگے مجھ کو　　تیز ہواؤں کو

اس شوخ ہتھیلی کا　　ہم آنکھ دکھائیں گے

فکریہ ماہیے

ہر شام نکھرتی ہے　　بس نام کا انساں ہے

وقت کے تیور سے　　لڑتا ہے جھگڑتا ہے

ہر صبح سنورتی ہے　　فطرت سے یہ حیواں ہے

طنزیہ ماہیے

دن رات نہیں ملتے　　قانون یہ کیسا ہے؟

خار کے پہلو میں　　جیت اسی کی ہے

کیا پھول نہیں کھلتے　　جس ہاتھ میں پیسہ ہے

پندیہ ماہیے

پنج وقتہ نمازی بن　　نقادِ سخن ہے وہ

قدر اگر چاہے　　تیغ قلم ہے تو

کردار کا غازی بن　　جلادِ سخن ہے وہ

﴿مختار ٹونکی کی نعت گوئی﴾ ﴿ربنا و سید نا ۔مجموعہ حمد ونعت﴾

اردو شعروادب میں حمد ونعت کو ادبی صنف کے طور پر خاص مرتبہ اور مقام حاصل ہے۔حمد ونعت پر خامہ فرسائی کرنے کے لئے عشق الٰہی اور عشق رسول لازمی ہے۔نعت گوئی کو تلوار کی دھار پر چلنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔جس میں بہت ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

راجستھان کے شہر ٹونک میں نواب ابراہیم علی خان کے عہد میں نعت گوئی کو فروغ حاصل ہوا۔وہ خود بھی اس صنف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ٹونک میں عید میلا دالنبی کے موقع پر سات روزہ محفل میلا د منعقد ہوا کرتی تھی۔جس کی وجہ سے یہاں پر کئی نعت گو شعراء بھی پیدا ہوئے۔مختار ٹونکی بھی اسی روش پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے شعری گلدستے میں حمد ونعت کا ایک مجموعہ'' **ربنا و سید نا** '' کے نام سے ۲۰۱۹ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔یہ مجموعہ تین حصوں حمد ومناجات،نعت ومناقب،اور سلام پر مشتمل ہے۔

اس مجموعے کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے بے حد خلوص اور صداقت سے لبریز خالق کائنات اور سرور کائنات سے اپنی عقیدت اور محبت کو بڑے احترام کے ساتھ پیش کیا ہے۔وہ اپنی تصنیف ''فکر پارہ پارہ'' میں اپنی نعت گوئی کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''حمد ونعت شاعری کا اعلیٰ علیین ہے جس طرح خدائے پاک وبرتر رب العالمین ہے۔اسی طرح سے سرکار دوعالمؐ رحمت للعالمین اور خیر البشر کے القاب سے مختص ہیں''[۱۳]

موصوف نے اپنے اس نعتیہ مجموعے کا آغاز حمدیہ کلام سے کیا ہے۔جس کا ابتدائی بند اس طرح ہے:

اے خدائے ذوالجلال

حمد ہے تیری محال

خلق کا خالق ہے تو قاسم ورازق ہے تو

پوجا کے لائق ہے تو اے پرستیدۂ خیال

اے خدائے ذوالجلال

اسی طرح دوسری جگہ پر وہ خدائے واحدہ لاشریک لہ کی تعریف میں کہتے ہیں کہ:

قادرِمطلق تری میں شان قدرت دیکھتا ہوں

ہر طرف بکھری ہوئی کثرت میں وحدت دیکھتا ہوں

جب کبھی نظریں اٹھا کر تیری خلقت دیکھتا ہوں

اک ٹھاٹھیں مارتا دریائے حیرت دیکھتا ہوں

کائنات کے ذرے ذرے میں رب العالمین کا جلوہ موجود ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر ہے۔ شجر حجر، برگ وشاخ، ارض سما، مہر وقمر ہر جگہ اس کو جلوہ موجود ہے۔ خدا کی اس جلوہ گری کو ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

لے فلک سے تا زمیں دو جہاں میں بالیقیں

کوئی بھی ہمتا نہیں دوسرا تجھ سا نہیں

یا الٰہ العالمیں

غائب و حاضر ہے تو، مخفی و ظاہر ہے تو

منظرو ناظر ہے تو، جلوہ گر ہے ہر کہیں

یا الٰہ العالمیں

تیری قدرت کے نشاں جاوداں ہیں جاوداں

تیری عظمت بے گماں تیری وحدت کی امیں

یاالہ العالمیں

تیرے ہیں مہرو قمر تیرے ہی تو بحروبر
برگ یہ شاخ و شجر اور ہوائے دل نشیں

یاالہ العالمیں

تو احد ہے اور صمد ،ذات تیری معتمد
جو رہے گی تا ابد ،یہ حقیقت ہے مبیں

یاالہ العالمیں

سوچنا بے سود ہے ،تو کہاں محدود ہے
ہرجگہ موجود ہے اور شہ رگ سے قریں

یاالہ العالمیں

موصوف کے حمد کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار میں معنویت ہے۔ جو دنیا کی حقیقت سے روشناس کرا کر خدا کی ذات سے منسلک کرتی ہے۔

پھر پھر کے بہت دشت و دریا دیکھے　　جا جا کے برابر کوہ و صحراء دیکھے
مقصد نہ ملا سب کو کھنگالا میں نے　　جلوہ تو خدا کا چشم بینا دیکھے

حمد و مناجات ،نعت و مناقب میں آپ حضور ﷺ کی شان اور ذات اقدس کے ساتھ اسوۂ حسنہ کا بیان بے حد عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں اس بابت اپنے مضمون ''اردو نعت گوئی'' میں رقم طراز ہیں:۔

''نعت کہنے کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ شاعر عشق نبیؐ کے مطہر جذبے سے سرشار ہو اور اپنے واردات قلبی اور کیفیات دلی کی آئینہ داری اس طرح کرے کہ دامن احتیاط ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ کمالات نبوت اور مدارج رسالت کی تصویر کشی کرتے وقت ذرا سی بے احتیاطی 'نعت' کو حمد کی حدوں میں داخل کر دیتی ہے

اور 'عبد' و 'معبود' کا امتیاز مٹ جاتا ہے مزید برآں یہ کہیں سرمو انحراف سے رسول اللہؐ کے اوصاف و محاسن انسانی سطح پر آجاتے ہیں یعنی نعت حد درجہ احتیاط اور آداب کی متقاضی ہے اور ہر ایک شاعر اس سے سرخرو نہیں ہوسکتا۔'' [۱۴]

مجموعے کا آخری حصہ سلام پر منحصر ہے۔ سلام آپ کے روضہ مبارک پر رک کر خلوص اور جذبہ عقیدت سے درود بھیجنا ہے۔ موصوف نے اپنے کلام میں بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنے جذبہ عشق کا بیان کیا ہے سلام کے ذریعہ حضورؐ کی شان میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنا ہے۔

سلام اس پر کہ احمد مجتبیٰ بھی جس کو کہتے ہیں
سلام اس پر کہ محمد مصطفیٰ بھی جس کو کہتے ہیں

سلام اس پر کہ جو صادق امین و معتبر ٹھہرا
سلام اس پر کہ دنیا میں جو سب سے مقتدر ٹھہرا

سلام اس پر کہ جس کے واسطے دنیا سجائی ہے
سلام اس پر کہ جس کی معترف ساری خدائی ہے

سلام اس پر جو احمد ہے احد سے میل کھاتا ہے
سلام اس پر خدا کے ساتھ جس کا نام آتا ہے

سلام اس پر کہ جس پر کبریائی ناز کرتی ہے
سلام اس پر کہ جس پر خود خدائی ناز کرتی ہے

سلام اس پر کہ جس نے بت پرستی کفر ٹھہرائی
سلام اس پر کہ جس ہے دکھائی راہ یکتائی

سلام اس پر حقیقت میں امام الانبیاء جو ہے
سلام اس پر رسولوں میں بھی محبوب خدا جو ہے

سلام اس پر کہ جس کا آستانہ ہے مدینے میں
سلام اس پر کہ جو رہتا ہے ہر مسلم کے سینے میں

سلام اس پر بہر عنواں جو ارفع ہے معظم ہے
سلام اس پر بہر صورت جو اعلیٰ ہے مکرم ہے

سلام اس پر جو سب کے کام آئے گا سر محشر
سلام اس پر ہمیں جو بخشوائے گا سر محشر

سلام اس پر کہ جو مختار ہے صلوٰۃ کے قابل
عقیدت کی ارادت کی ہر اک سوغات کے قابل

موصوف نے اپنے مجموعہ کلام میں الف کے استعمال کے بغیر ایک سادہ نعت بھی پیش کی ہے۔ جو ان کی فنی پختگی کا ثبوت ہے۔ جس کے چند اشعار ذیل میں دئے جا رہے ہیں:

حسیں سے حسیں تر وہی زندگی ہے
جو عشق محمدؐ میں ہے ڈوبی ہوئی ہے

درودوں کی رم جھم سے محفل سجی ہے
محمدؐ محمدؐ کی رٹ سی لگی ہے

وہ پہلے نبیؐ ہیں نبی ہیں مؤخر
رسولوں میں سب سے فضیلت بڑی ہے

یہ عشق نبی کی تجلی ہے بے شک
مرے دل میں پھوٹی عجب روشنی ہے

نبی جی کے رستے پہ چلوں میں ہمیشہ
نبی جی کی مرضی مری ہر خوشی ہے

نظر کو بھی دیکھو میرے دل کو بھی دیکھو
چھبی سبز گنبد کی چھپ سی گئی ہے

سرحشر سب کی مدد کو وہ پہنچے
سرحشر دیکھو تو خلقت کھڑی ہے

وہی قلزم جود و بخشش، کرم ہیں
مگر بوند بھر کی بھی حسرت بڑی ہے

تخلص نہیں ہے مری نعت میں جو
تو سوچو کہ کوئی مشکل پڑی ہے

انھوں نے اپنے اس مجموعے میں بہت ہی عمدگی سے، خلوص وعقیدت سے، تعظیم وتقدس کے ساتھ اپنے احساس کی شدت کو خوبصورت پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔ ان کا کلام لائق تحسین ہے کہ وہ پاکیزہ جذبات اور احساسات کی آئینہ داری کرتا ہے۔

مختارؔ ٹونکی کی شاعری ان کے مطبوعہ شعری مجموعوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کے کلام کا معتد بہ حصہ غیر مطبوعہ ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر پڑھے جانے والے سہرے اور سہاگ یعنی رخصتی کے وقت گائے جانے والے گیت کی بھی ہمارے سماج میں ایک اہمیت رہی ہے جن میں خوشی اور دعاؤں کے ساتھ جوڑوں کی کامیاب زندگی کی دعا کی جاتی ہے۔ انھوں نے لاتعداد سہرے اور (سہاگ) رخصتی کے گیت لکھے ہیں جو ان کی ذاتی بیاض میں موجود ہیں جو کہ غیر مطبوعہ ہیں۔ اور وہ بھی ان کی ادبی وفنی صلاحیت کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ ذیل میں ان کے لکھے ہوئے سہرے اور رخصتی کے گیت کا نمونہ پیش ہے۔

﴿سہرا﴾

صد شکر تیرے رخ پر ہے آشکار سہرا　　دل کی کلی کھلی ہے لایا بہار سہرا
پھولے نہ کیوں سمائیں خوشیاں نہ کیوں منائیں　　جان چمن ہے دولہا جان بہار سہرا

گل مسکرا رہے ہیں کلیاں بھی ہنس رہی ہیں صدر شک گلستاں ہے یہ پر بہار سہرا
خورشید بھی فلک پر شرما کے رہ گیا ہے دیکھا ہے جب سے اس نے یہ نور بار سہرا
شرمندہ کر رہا ہے نسرین و نسترن کو یہ عطر بیز سہرا یہ مشک بار سہرا
ماں باپ کے دلوں پر چھائیں نہ کیوں بہاریں خود آ گیا ہے بن کے فصل بہار سہرا
موتی پروئے کیا کیا سہرے کی ہر لڑی میں ہیں تاب دار لڑیاں ہے آب دار سہرا
ہر شخص جھومتا ہے فرط خوشی سے سن کر گویا زبان دل سے ہے نغمہ بار سہرا
لڑیاں خوشی کے مارے پھولوں نہیں سماتیں باندھا ہے جب سے تو نے اے گلعذار سہرا
باندھے خلیق جیسا دولہا جب اپنے سر پر مختارؔ کیوں نہ لکھے یہ شان دار سہرا

☆ ☆ ☆

سہاگ ﴿رخصتی﴾

گہنوں میں لدی عذرا پھولوں میں سجی عذرا
شہرت ہے زمانے میں دلہن جو بنی عذرا
بابل سے جدا ہو کر ڈولی میں چلی عذرا

☆

مہندی کو رچایا ہے افشاں کو لگایا ہے
ماتھے کو ذرا دیکھو جھولر سے سجایا ہے
سج دھج کے جو بیٹھی ہے قسمت کی دھنی عذرا

☆

اک کامنی صورت ہے اک موہنی مورت ہے
معصوم سا چہرہ ہے کیا شکل و شباہت ہے

اللہ رے زیبائی لگتی ہے پری عذرا

☆

خوشبو سا بدن ہوگا خوشیوں کا چمن ہوگا
مستی کی گھڑی ہوگی ساجن سے ملن ہوگا
یہ سوچ رہی ہوگی خوشیوں سے بھری عذرا

☆

شادی کا بہانہ ہے کچھ گیت بھی گانا ہے
لو آؤ ہنسیں بولیں خوشیوں کو منانا ہے
چھیڑیں اسے چل کر مصری کی ڈلی عذرا

☆

سردار کی پیاری کو ننھی سی دلاری کو
دیتے ہیں دعائیں سب اس راج کماری کو
بہنیں بھی یہ کہتی ہیں بنّے کی بنی عذرا

☆

یادوں کو مٹا دے گی بابل بھلا دے گی
آخر تو یہی ہوگا بس پی کو وفا دے گی
دیکھو وہ چلی گھر سے نازوں سے پلی عذرا
--------- ڈولی میں چلی عذرا

اس طرح کے درجنوں سہرے اور سہاگ ان کے پاس محفوظ ہیں خدا کرے کہ وہ بھی جلد منظر عام پر آئیں تا کہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہو سکے۔

ہزلیات :۔

مختار ٹونکی نے جہاں مختلف اصناف پر قلم اٹھایا ہے وہیں پر انھوں نے ہزلیات میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مختار صاحب نے طنز و مزاح نگار کے طور پر بھی اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے۔ چونکہ طنز و مزاح ان کی فطرت میں شامل ہے ادبی محافل اور مشاعروں میں وہ طنز و مزاح نگار کے طور پر بھی شرکت کرتے رہے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے سب رنگ سخن کے میں ان کے کل ۱۸ ہزلیات شامل ہیں۔ ان کے مزاج میں مزاحیہ عنصر تو شامل ہے اس کے ساتھ ان کے یہاں پر طنز کا تیکھا پن بھی بدرجۂ اتم موجود ہے جو ان کی خوش ذوقی اور نیرنگی کو ظاہر کرتا ہے۔ درج ذیل اشعار ان کے اس ذوق کی وضاحت کرتے ہیں۔

اگر میں نیتا بن جاتا تو قسمت ہی بدل جاتی — بنا ہوں ایک ٹیچر ہائے کیا کر لیا میں نے

جاتا تو اس کے در پہ ہوں لیکن ڈرا ہوا — میں کیا کروں کہ گھر پہ ہے کتا پلا ہوا

ہمیں بدنام کرنا تھا اسے تو — وطن کا نام جا پانی کریں گے

مجھے لگتا ہے یوں محبوب کا چیچک زدہ چہرہ — منقش جس طرح ظرف مراد آبادی ہوتا ہے

کسی بھی ساس سے پوچھو کہے گی وہ یہی فوراً — بہت ہی لالچی اب تو ہر اک داماد ہوتا ہے

ایک بندے نے یہ کل مجھ سے کہا تھا مختارؔ — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس کے علاوہ ان کا رنگ اس انداز سے بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔

مجھ کو بیڑی نہ پان دے اللہ — روٹی کپڑا مکان دے اللہ

سن لو دھر کر وہ کان دے اللہ — جب بھی ملا اذان دے اللہ

لکھ پتی باپ کی وہ بیٹی ہو — چاہے بوڑھی جوان دے اللہ

اپنی بیگم سے لڑ سکوں کشتی — ہاتھ پیروں میں جان دے اللہ

پھیکے پکوان میں نہ کھاؤں گا — مجھ کو نیچی دوکان دے اللہ

اردو شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہندی شاعری میں بھی کمال فن کا مظاہر کیا ہے۔ اگر چہ ان کا یہ

کلام کم ہی ہے جو کسی کتاب میں شامل نہیں ہے البتہ نیٹ پر ضرور دستیاب ہے۔ ہندی رسالوں میں ضرور چھپے ہیں ان کی دو نظم مندرجہ ذیل ہیں:

कविता

प्रश्न

एक नहीं

सैंकड़ो सीताएं

मेरे नगर में घूमती है

अपनी लंका छोड़कर

बहुत से रावण

यहां पर ये हैं

मुझे इतना बतादे

इस युग का राम किधर ह

बाल कविता

जी हां पिटे हैं।

गुड़िया की आंख फोड़ी

गुड्डे की टंग तोड़ी

वो हमपे हंस रही थी

गरदन जरा मरोड़ी

मुन्नी ने की शिकायत

यूं हमने मार खाई

अम्मी ने की पिटाइ

انھوں نے بتایا کہ ہندی رسالوں میں بھی خوب چھپے ہیں اور ان کی نظمیں ہندی ناقدین کی نگاہ میں پسندیدہ ٹھہرتی ہیں۔

﴿حوالہ جات باب چہارم﴾

۱ راجستھان میں شعری گل دستوں کی روایت اوران کی اہمیت ڈاکٹر نادرہ خاتون ص۲۶

۲ مختارٹونکی شخصیت اورفن مقالہ برائے ایم فل ص۵۸

۳ اردوشاعری (قصیدہ، جدیدغزل اورنظم) اکائی ۸ جدیدغزل ص۱۰۹ V.M.O.U Kota

۴ اردوشاعری کافنی ارتقاء ڈاکٹرفرمان فتح پوری قطعہ اوراسکے مماثل اصناف ص۴۱۲۔۴۱۱

۵ اردو کے منتخب گیت ڈاکٹر قیصر جہاں ص۹۔۱۰

۶ فکر پارہ پارہ مختارٹونکی اردوشاعری میں گیت نگاری ص۱۹۳

۷ اردوادب کے ہمہ جہت قلم کار ڈاکٹرفراز حامدی رفیق شاہین ص ۵۸

۸ اردو میں شاعری کافنی ارتقاء ڈاکٹرفرمان فتح پوری ص۵۵۰

۹ شوکت بیانی صاحب زادہ شوکت علی خاں ص۳۵

۱۰ شوکت بیانی صاحب زادہ شوکت علی خاں ص۳۷

۱۱ صدرنگ ماہیے مختارٹونکی ص۵

۱۲ صدرنگ ماہیئے مختارٹونکی ص ۸

۱۳ فکر پارہ پارہ مختارٹونکی ص ۱۰

۱۴ فکر پارہ پارہ مختارٹونکی ص۱۵

باب پنجم

مختار آٹو نکی بحیثیت ادب اطفال نگار

باب پنجم

مختار ٹونکی بحیثیت ادب اطفال نگار

{ ادب کی تعریف }

زمانہ قدیم سے انسان اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا ہے وہ اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کے لیے غاروں کی دیواروں اور پتھروں پر تصویر بنا کر کرتا تھا پھر رفتہ رفتہ اپنی ذہنی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے حضرت انسان نے درجہ بدرجہ کاغذ اور قلم تک رسائی حاصل کی اس کے ساتھ اس نے جن پریوں، راجہ رانی کی کہانی اور داستانوں کو بیان کرتے ہوئے فن تخلیقات تک اپنے شعوری اور غیر شعوری خیالات کے اظہار کے ساتھ ہی ترقی کرتے ہوئے اس روایت کو ادب کی شکل دی۔

ادب کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین کہتے ہیں کہ

''ادب شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے ہوئے خیالات کا نام ہے جو زندگی کی چھیڑ سے جاگتے ہیں۔ زندگی کی آنچ میں تپتے ہیں اور زندگی کے سانچے میں ڈھل کر خود زندگی بن جاتے ہیں'' ا؎

ادب زندگی کی ترجمانی کرتا ہے ادب کے ذریعہ زندگی میں پیش آنے والے روزمرہ کے واقعات، خیالات و احساسات کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ زندگی کے واقعات و خیالات کے ساتھ زندگی کے تجربات کا بھی خلاصہ کرتا ہے ادب زندگی کے مسائل کو پیش کرنے کا ایک بہترین وسیلہ ہے۔

{ بچوں کا ادب }

بچوں کے ادب سے مراد وہ ادب ہے جو ہر عمر کے بچوں کی نفسیات، شوق، دلچسپیوں اور ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا جائے اور ان کی زبان و بیان، عقل و فہم، شعور اور قوت متخیلہ کو سامنے رکھ کر دلچسپ موضوعات کا انتخاب کیا جائے۔ بقول شفیع الدین نیرؔ:

''جوادب چار پانچ سال کی عمر سے لے کر تیرہ، چودہ، ہبرس تک کے بچوں کے لئے
مخصوص ہو، اسے ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔''[۲]

بچے قوم کا سرمایہ ہوا کرتے ہیں جس کی وجہ سے قوم کا مستقبل بھی ان پر ہی منحصر ہوتا ہے اور بچوں کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کی ذمہ داری قوم کے اوپر ہی ہوتی ہے۔ یہ امر اسی وقت قابل قبول ہے جب کہ ہم ایک مناسب تعلیم وتربیت اپنی نوخیز نسل کو دیں اور ان کے ذہنی نشو ونما کے ساتھ جذبات واحساسات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی عمر اور طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے اس انداز سے کھیل کھیل میں تعلیم مہیا کرائی جائے کہ ان کو گراں بھی نہ گزرے اور مقصد تربیت بھی حاصل ہو جائے۔

زیب النساء اپنی تصنیف ''اقبال اور بچوں کے ادب'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''بچے قوم کے معمار ہیں۔ اور آئندہ نسل کی سیرت سازی ان کے ذمہ ہے۔ اس لئے
بچوں کے ادب میں بے باکی، خود اعتمادی، جملوں کی ترتیب، صرف ونحو سے آگہی،
ساتھ مل کر گانے کی عادت، حرکات وسکنات کے ذریعہ جذبات کا اظہار الفاظ کا صحیح
طریقے سے ادا کرنا عام معلومات میں اضافہ، گیتوں کے ذریعہ اور کھیل کھیل میں تعلیم
بچوں کی طبیعت میں موزونیت پیدا کرنے والے اسباب وغیرہ شامل ہونے چاہئیں''[۳]

آغوش مادری کو بچے کی پہلی تعلیم گاہ قرار دیا گیا ہے۔ ماں کی لوریوں اور گیتوں سے بچوں کے ادب کا آغاز مانا جاتا ہے۔ جہاں پر وہ بلا کسی درسی کتاب کے ذہنی نشونما کے ساتھ تربیت پاتا ہے۔ بچے کے پہلے استاد اس کے والدین ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ اسکول جاتا ہے تو استاد کی شفقت میں تعلیم وتربیت پاتا ہے اسکول میں تعلیمی نقطہ نظر زیادہ اہم ہوتا ہے۔ نصابی کتابیں ایک مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے محدود تعلیمی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ نصابی اور درسی کتب سے ہٹ کر بچوں کی تعریف وتوصیف اور تحسین وشناسائی کے لئے ملک کی ہر زبان میں ادب اطفال کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے اس بات پر غور وفکر کیا جانا چاہیے کہ بچوں کا ادب کیسا ہو؟ اور وہ بڑوں کے ادب سے

کس قدر مختلف ہو نیز ان کے ادب میں بچوں کی درسی کتابوں کے علاوہ اور کس طرح کی کتابوں کو شامل کیا جانا چاہیئے ؟ جو کہ ان کی قوت متخیلہ کے مطابق ہو اور ان کی ذہنی نشو ونما میں معاون اور مددگار ثابت ہو سکے ۔ بچوں کا ادب ان کی ذہنی صلاحیت اور عمر کے مطابق کیسا ہو؟ اس سلسلے میں شفیع الدین نیر صاحب کا کہنا ہے کہ:

''بچوں کے ادب سے مراد نظم ونثر کا وہ ذخیرہ ہے جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لیے موزوں ہو یا یوں سمجھئے کہ جو ادب چار پانچ سال کی عمر سے تیرہ چودہ برس تک کے بچوں کے لیے مخصوص ہو، اسے ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کرتے ہیں ۔ بلا شبہ بچوں کو کو ادب کو بھی ان اقدار اور خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے جو کسی بھی زبان کی نظم و نثر کو ادب کا درجہ بخشتی ہے ۔ ان تحریروں میں خیال کی رفعت، جذبہ کی صداقت، زبان کی لطافت اور بیان کا حسن شامل ہیں ۔''(۴)

بچوں کے ذہنی معیار کے اعتبار سے ادب تخلیق کرنا ایک مشکل ترین کام ہے ۔ بچوں کے سوچنے سمجھنے کا طریقہ بڑوں سے الگ ہوتا ہے ۔ وہ فطرت کی ہر چیز کو بڑے ہی غور وفکر کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اکثر بڑوں کی نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں ۔ بچوں اور بڑوں کی نفسیات ، فطری قابلیت ، لیاقت اور کاریگری کے ساتھ بچوں کے ادب میں بھی اختلاف ہوتا ہے اس امر سے ان کے موضوعات میں بھی فرق پایا جاتا ہے اس لحاظ سے مصنف کو بچوں کی نفسیات اور جذبات تخیل اور تجسس کا قایم رکھتے ہوئے ادب تخلیق کرنا چاہیئے ۔

برٹینیکا جونیر انسائیکلو پیڈیا میں بچوں کے ادب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

It is all surprising that books suitable for boys and girls began to appear only about 200 years ago, yet stories which children enjoyed weretold bywords of mouth for countless generation.(5)

بچوں کی شخصیت کی تشکیل کرنے کے لئے بچوں کے ادب میں نفسیاتی اصول اور ذہنی نشو ونما کو مرکزی

حیثیت حاصل ہے ۔ بچوں کی ذہن کو درمیان میں رکھ کر تشکیل کیا گیا ادب بچوں کی زندگی کی حقیقوں اور سچائیوں کو جاننے اور سمجھنے کی قوت عطا کرتا ہے ۔ ہری گرش دیوسری بچوں کے ادب کے بنیادی عناصر کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

बाल साहित्य की रचना के मूलाधार के ही तत्व तथा मनोवैज्ञानिक नियम है। जो बच्चों को स्वस्थ मानसिक विचारधारा वाला व्यक्ति बनाने के लिए आवश्यक है। बाल साहित्य उन अंकुरों की पुष्ठि करता है जो बड़े होकर उन्हें जीवन के सत्य को पहचाने में सहायता करें।

ان توضیحات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بچوں کا ادب لکھنا بہت ہی مشکل ہے کیونکہ اس میں خود قلم کار کو ایک بچہ بن کر ان کی نفسیات ،ضروریات اور دلچسپیوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے قلم اٹھانا پڑتا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ان کو شعر و ادب کے ذریعہ ان کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کرنی ہوتی ہے کیونکہ ان کی کردار سازی ہی ادب اطفال کا اصل مطمح نظر ہوتا ہے ۔ اس لیے کسی بھی لکھنے والے کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ان سب باتوں سے عہدہ برآ ہو ۔ علاوہ ازیں بچوں کا ادب ایک منصوبہ بند طریقے سے بھی لکھا جانا چاہیئے ، جیسا کہ خود مختار ٹونکی اپنے ایک مضمون ''کیسا ہو بچوں کا ادب'' میں رقم طراز ہیں کہ

> ''عام طور پر بچوں کا ادب ایک ہی سطح اور ایک ہی نہج پر لکھا جاتا ہے ۔ ادیب لوگ مان لیتے ہیں کہ سبھی قسم کے بچے ایک ہی طرح کے بچے ہیں ۔ حالانکہ بچے عمر کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہیں اور عمر کی ہر منزل میں وہ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں ۔ ان میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے ، ان کی دلچسپیاں بدل جاتی ہیں ، خواہشات تبدیل ہو جاتی ہیں اور ان کی سوچیں بھی نیا روپ لے لیتی ہیں ۔ ایسی صورت حال میں بچوں ''ایج گروپ'' (Age group) بنانا بہت ضروری ہے ۔ ایک ایج گروپ کے بچے دوسرے ایج گروپ کے ادب کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں اور نہ اس کو وہ پڑھنے میں زیادہ دلچسپی دکھاتے ہیں ۔ بچوں کی عمر کے حساب سے تین درجے تو مقرر

کرنے ہوں گے۔

۱۔تین سال سے سات سال ۲۔آٹھ سال سے دس سال ۳۔گیارہ سال سے پندرہ سال'' ۷

اردو ادب میں ادب اطفال کی رفتار و روایت

اردو ادب میں ادب اطفال ابتدا ہی عالم وجود میں آ گیا تھا۔ فارسی کی کتاب نصاب النصاب کو اردو کی نصابی نوعیت کا پہلا نمونہ قرار دیا گیا ہے۔جس میں عربی و فارسی کے اشعار موجود تھے۔اس کے علاوہ خالق باری سے بھی ادب اطفال کا آغاز مانا جاتا ہے۔محمود الرحمان اور ریاض صدیقی نے خالق باری کو ادب اطفال کی پہلی تصنیف تسلیم کی ہے۔اس سلسلے میں محمود الرحمان اپنی تصنیف ''آزادی کے بعد کا ادب'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''اردو میں بچوں کے ادب کا آغاز اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے ہوتا ہے۔ اس زمانے میں نوعمر افراد کے لیے متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں۔جو زیادہ تر لغت پر مشتمل تھی مثلاً خالق باری ایزد باری، صفات باری وغیرہ۔ان کتابوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ نہایت آسان اور دلچسپ اشعار کے ذریعہ بچوں کو عربی فارسی الفاظ کے معنی سے متعارف کرایا جائے'' ۸

امیر خسرو کے خالق باری کے ساتھ ان کی پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں بھی اطفالی ادب میں شامل ہیں جو کہ بچوں کی دلچسپی اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے مشکل اور پیچیدہ تو ہیں مگر وہ ظرافت شائستگی اور تفریح کے ساتھ ساتھ ان کے اندر غور و فکر کا مادہ بھی پیدا کرتی ہیں۔جب کہ ہندوستان میں سنسکرت کی قدیم کہانیوں کو ادب اطفال کے آغاز کی بنیاد مانا جاتا ہے۔ان کہانیوں میں پنڈت وشنو شرما کی تصنیف ''پنچ تنتر'' کو مقدم مانا جاتا ہے۔جو کہ جانوروں کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔اسی کے ساتھ وہ علمی اعتبار سے بھی کافی مقبول ہے۔ سنسکرت زبان میں پریوں اور جانوروں کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ نصیحت آموز کہانیاں بھی ملتی ہیں۔

اردو میں ادب اطفال کی ابتدا نصابی تعلیم سے ہوئی یہ کتابیں اردو میں تہذیبی اور معاشرتی حقائق کے

ساتھ تعلیم وتربیت کی غرض سے بھی لکھی گئیں۔ دکن میں شاہ حسین ذوقی کی مثنوی ''ماں باپ نامہ'' میں ادب اطفال کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ اس مثنوی میں والدین کی فرمانبرداری اوران کی خدمت کی نصیحت ہے۔ شمالی ہند میں ولؔی کی آمد کے بعد ادبی تخلیقات میں بچوں کا ادب بھی شامل ہوا تو میر تقی میرؔ نے بچوں کے لیے مثنوی کی شکل میں نظمیں لکھیں۔ جن میں موہنی بلی، بکری اور کتے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ میر کے علاوہ نظیر اکبرآبادی بھی ادب اطفال کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ نظؔیر نے سادہ اور عام فہم زبان میں بچوں کے لیے حب اوطنی کا جذبہ پیدا کرنے والی وطنی، اخلاقی، درسی کے ساتھ پند ونصیحت پر نظمیں لکھیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کی ناکامی کے بعد ملک میں جب حکومت برطانیہ کا مکمل طور پر اقتدار ہوگیا تو انگریزی حکومت نے ملک کی مختلف علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو میں بچوں کے کی تعلیم پر ضرورت کے تحت توجہ کی۔ دوسری جانب سرسید تحریک کے زیر سایہ مولوی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، شبلی نعمانی جیسے لوگوں نے منظّم طریقے سے نثر ونظم دونوں اصناف میں مختلف موضوعات پر بچوں کی نفسیات اور مزاج سے واقفیت رکھتے ہوئے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

ادب اطفال کا زیادہ تر ذخیرہ سرسید اوران کے رفقاء کی بدولت ہے۔ اس ادب کی بنیاد کا استوار کرنے میں خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد کے کارناموں کو آگے بڑھانے میں علامہ اقبال، پنڈت برج نرائن چکبست، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم اور حامد اللہ افسر وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ ان لوگوں نے بچوں کے مزاج اوران کی نفسیات کے مطابق ادب کی تخلیق کر کے ادب اطفال کے ذخیرہ میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی اسماعیل میرٹھی کا نام بھی قابل ذکر ہے جو کہ بچوں کے عظیم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں انھوں نے بچوں کی درس وتدریس کی درجہ اول تا پنجم کی نصابی کتابیں لکھیں جو کہ تعلیم وتربیت کا آج بھی معیار تسلیم کی جاتی ہیں۔

انیسوی صدی میں علم القواعد سے زیادہ درس وتدریس کے مضامین پر زور دیا گیا اس کے بعد ادب اطفال نفسیاتی، اخلاقی، سائنسی اور جدید دور کے اصول اور تقاضے کے ساتھ بیسویں صدی میں داخل ہوتا ہے

بیسویں صدی کا دور ادب اطفال کے لیے ایک سنہرا دور مانا جاتا ہے۔اس دور کے اہم قلم کاروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، عابد حسین، اطہر پرویز، قدسیہ زیدی، عبدالغفار مدھولی، شفیع الدین نیر نے اپنی ادبی جد وجہد کو جاری رکھا تو وہیں دوسری جانب ادب اطفال کی نشو ونما اور اس کو فروغ دینے میں جامعہ کے مصنفین کے ساتھ ساتھ دیگر قلم کاروں کا بھی اہم رول رہا ہے۔، ان قلم کاروں میں خورشید الاسلام ،عصمت چغتائی ،نورالحسن ہاشمی ،کرشن چندر، خوشحال زیدی، وقار خلیل ،کنہیالال کپور، غلام ربانی تاباں ،قرۃ العین حیدر، سہیل عظیم آبادی، رضیہ سجاد ظہیر، سراج انور، مظفر حنفی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ادب کی ان نامور شخصیات نے عصر حاضر کی ضرورتوں اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ادب کی بھرپور آبیاری کی۔انھوں نے وطن پرستی ،قومی یکجہتی ، اخلاقی زندگی ، انسان دوستی ، ہمدردی ،ملکی مسائل ، مساوات جیسے موضوعات کو لیتے ہوئے ادب اطفال کے سرمایے میں اضافہ کیا۔ادب اطفال کی ضرورت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس میں اپنے مضامین لکھے اور بچوں کے لیے ایک نیشنل بک ٹرسٹ قائم کیا۔

بیسویں صدی کا دور بچوں کے ادب کے لیے ایک عہد زریں رہا ہے۔اس دور میں بچوں کے ادب کی ترقی اور اشاعت میں مصنفین کے ساتھ متعدد رسائل و جرائد اور اخبارات کا بھی اہم رول رہا ہے۔ حالانکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بچوں کے ادب پر خاطر خواہ توجہ دی جانے لگی تھی۔آزادی کے بعد سے موجودہ دور تک رسائل کے نکلنے کا سلسلہ جاری ہے۔

ڈاکٹر محمد ثنا احمد اپنی کتاب ''ہندوستان میں بچوں کے رسائل'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''آزادی کے بعد سے اردو زبان کے بدلتے ہوئے موقف کی وجہ سے بچوں کے ذریعہ تعلیم میں تبدیلی آئی۔آہستہ آہستہ اردو تعلیم میں کمی کے باعث اردو رسائل کے پڑھنے والوں میں بھی کمی آتی گئی۔ بہرحال آزادی کے بعد کے اس دور میں بچوں کے رسائل کی ایک قابل قدر تعداد ایسی بھی رہی ہے۔جو کامیابی کے

ساتھ جاری ہوئے تھے اور آج بھی ننھے منے قارئین کی ذہنی تربیت اور ان کے
ذوق کی تہذیبی آبیاری میں مشغول ہیں۔ زمین سخت اور آسمان دور ہیں لیکن
ہمت پرواز ابھی ٹوٹی نہیں ہے'' ۹

موجودہ دور میں ابھی بھی بچوں کی فکر اور نفسیات سے مناسبت رکھنے والے مضامین، کہانیاں اور نظمیں تخلیق کی جارہی ہیں جو کہ بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی صلاحیتوں کو جلا بخش رہی ہیں۔ان رسائل میں پیام تعلیم (نئی دہلی)، ماہنامہ نور (رام پور)، ماہنامہ ہلال (رام پور)، سہ ماہی سائنس کی دنیا (نئی دہلی)، ماہنامہ امنگ (نئی دہلی)، ہفت روزہ خیر اندیش (مالیگاؤں)، ماہنامہ اچھا ساتھی (بجنور)، ماہنامہ گل بوٹے (ممبئی)، ماہنامہ گلشن اطفال (مالیگاؤں،) ماہنامہ گلدستہ تعلیم (نئی دہلی)، ماہنامہ فن کار (حیدرآباد)،صدائے اطفال (بنگلور)، دوماہی غبارہ (بنگلور)، ماہنامہ بچوں کی دنیا (نئی دہلی) شائع ہورہے ہیں۔ ۱۰

مختار ٹونکی اور ادب اطفال

عہد حاضر میں ادب اطفال کی آبیاری کرنے اور اس میں اضافہ کرنے والوں میں مختار ٹونکی کا نام قابل ذکر ہے جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ مختار ٹونکی طنز و مزاح نگار کے ساتھ ساتھ منفرد شاعر بھی ہیں اسی کے ساتھ ان کی پہچان ایک اطفالی ادب کے شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے بھی ہے۔

موصوف نے اطفالی ادب کے تعلق سے شعری اور نثری دونوں اصناف میں خامہ فرسائی کی ہے شاعری میں بچوں کے لیے انھوں نے نئے نئے انداز میں مختلف موضوعات پر جہاں خوب نظمیں لکھی ہیں وہیں انھوں نے نثر میں بچوں کے لیے کہانیوں کے ساتھ دلچسپ جاسوسی ناولٹ بھی تحریر کیے ہیں۔کہانیوں میں بچوں کے لیے حقیقی موضوعات پر ''سچی کہانیاں'' اور ''دیسی لوک کہانیاں'' کے عنوان سے شائع کی ہیں ناولوں میں ''عیار عورت'' ''خونی غبارے'' ''ڈاکو نیلم'' اور پراسرار فقیر شامل ہیں۔

چونکہ موصوف شروع ہی سے درس و تدریس کی خدمات سے منسلک رہے ہیں اس لیے ان کے تجربات

،مشاہدات ،اور نفسیاتی مطالعہ گہرائی لیے ہوئے ہے اسی وجہ سے بچوں کے جذبات و احساسات اور طبیعت و مزاج سے بخوبی واقف ہیں انھوں نے اپنے ان تجربات سے فائدہ اٹھا کر بچوں کے لیے ایسی نظمیں لکھیں جو ان کے لئے دلچسپی کا ذریعہ بن سکتی ہیں ۔ انھوں نے اپنی نظموں اور کہانیوں میں بچوں کے جذبات اور احساسات کو مدنظر رکھا ہے۔ زبان عام فہم اور سادہ ہے ان کی شاعری میں جمالیاتی قدروں کا اظہار ملتا ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری ایک نئے معیار پر نظر آتی ہے۔

موصوف کو ادبی عبور حاصل تو تھا ہی لیکن دوران تعلیم و تدریس بچوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کی ذہنیت، خیالات، احساسات و جذبات کو سمجھتے ہوئے ان کو ادب اطفال پر بھی عبور حاصل ہو گیا تو ان کی بچوں کے ادب کی شروعات کی پہلی کاوش ''بدحواسی'' کے عنوان سے ہفتہ وار'' آئینہ'' میں بچوں کے صفحات پر شائع ہوئی اس کے بعد انھوں نے بچوں کے مختلف رسائل غنچہ، پھلواری، کھلونا، ٹافی، کلیاں اور اردو کامکس وغیرہ میں اپنی نگارشات شائع کروائیں۔

شاعری سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت عوام و خواص کے ساتھ بچوں میں بھی ہوتی ہے ۔بچوں میں نغمگی و غنائیت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت قدرتی ہوتی ہے ۔ بچے ماں کی گود ہی سے نغمگی سیکھ جاتے ہیں۔ جب وہ ماں کی منظوم لوری سنتے ہیں ۔ترنم ،نغمگی اور تک بندی کے انداز میں کی جانے والی باتیں بچے کو فوراً یاد ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے بچوں کو گیتوں اور نظموں کے ذریعہ معلومات فراہم کرانا آسان ہو جاتا ہے مختار ٹونکی نے بھی کم سن چھوٹے چھوٹے نونہالوں کے لیے نظمیں لکھی ہیں اور ایک مجموعہ بھی تیار کیا ہے جو کہ بچوں کے ذہن نفسیات اور دلچسپی کا ترجمان ہے۔

﴿ ادب اطفال (شاعری کی حوالے سے) ﴾

شعر ہر عمر کے لوگ بڑے ہی شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں، شاعری میں موجود نغمگی ،غنائیت اور ترنم سے بڑوں کے ساتھ بچوں کے ذہن کو بھی متاثر ہوتے ہیں۔ بچے نثر کے مقابلے میں نظم کو با آسانی یاد کر لیتے ہیں شاعری بچوں کی ذہنی اور تخئیل کی پرواز کو بلند کرتا ہے۔

شاعری کی حوالے سے مختارؔ ٹونکی کا بچوں کے لیے خاص طور پر ایک مجموعہ ''یہ دنیا بچوں کی'' کے عنوان سے ہے اس مجموعے میں شامل نظمیں بچوں کے اعتبار سے کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ان کا یہ مجموعہ کلام ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آیا تھا جس میں تقریباً ۷۶ چھوٹی چھوٹی نظمیں شامل ہیں۔ جو اپنے نئے آہنگ اور نئے انداز بیان و نئے خیالات کے ساتھ اپنے ننھے منے قارئین کے لیے لکھی ہے۔

موصوف نے اس مجموعے میں بچوں کی ذہنیت ، خیالات ،نفسیات کے ساتھ صلاحیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قومی ، وطنی ،اخلاقی ، پند ونصیحت ، مذہبی اور دینی ،شجاعت و بہادری ،علمی و ادبی ،نیچرل اور درس و تدریس جیسے موضوعات کو سامنے رکھ کر نظمیں لکھیں تا کہ بچوں کی مثبت انداز میں تربیت ہو سکے۔

''یہ دنیا بچوں کی'' مجموعہ میں موصوف نے اپنی نظموں کی ابتدا ''حمد باری تعالی'' سے کی ہے۔خدا نے اپنی تمام ہی مخلوقات کو ذاتی صفات عطا کی ہیں۔اس کا ذکر نظم میں کیا گیا ہے۔نظم کے آخر میں مختار صاحب خود اپنی شاعرانہ عظمت کا شکر ادا کرنا ہوئے کہتے ہیں کہ:

سجدے لٹا رہے ہیں تیری یہ بندگی میں　　بندوں کو سر جھکانا کس نے سکھایا،تو نے
اشعار حمد یہ جو مختارؔ کہہ رہا ہے　　یہ رنگ شاعرانہ کس نے سکھایا،تو نے

خدا کی حمد کے بعد سرور کائنات محمد ﷺ پر'' پیارے محمد ﷺ'' کے نام سے ایک نعت ہے۔ اس میں انھوں نے آپ کی توصیف عظمت وشان اور بہادری کی تعریف بیان کر کے شفاعت کی طلب کی ہے۔ جو بڑے ہی دل کش اور محبت بھرے انداز میں بیان کی گئی ہے کہ:

مصیبت اٹھائی سہے ظلم لیکن　　کبھی دشمنوں سے نہ ہارے محمدؐ
انہیں کی شفاعت کا بس آسرا ہے　　ہمارے ہیں بے شک سہارے محمدؐ
یقین شفاعت ہے مختارؔ ہم کو　　محمدؐ کے ہم ہیں، ہمارے محمدؐ

مختارؔ ٹونکی کی نظموں میں دینی اور مذہبی نظمیں اونچا مقام رکھتی ہیں۔ مذہبی اور دینی نظموں کے تحت خدا کی شان وشوکت ،عظمت و طاقت، خدا کی قدرت کی کاریگری کا جاہ وجلال کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ان

کے اس مجموعے میں اس نوعیت کی بہت سی نظمیں ہیں ۔جن کے عنوانات درج ذیل ہیں ۔
بتاؤ تو بھلا ،ھوالرزاق ،سب سے بڑا خدا ہے،قدرت کی کاریگری ، رب کا شکر ادا کر بھائی ، رب کی دین ،قدرت کا کارخانہ، وغیرہ اس بابت چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں :

جو رب ہے کل جہانوں کا　　اسی رب کا وہ کھاتے ہیں
کروڑوں لوگ دنیا کے　　اسی سے رزق پاتے ہیں
جہاں کو رزق دیتا ہے
بڑا رزاق ہے اللہ　　(ھوالرزاق)

ہاں ہاں ! وہ کبریا ہے　　سب سے بڑا خدا ہے
اوجھل ہے آنکھ سے وہ　　پیدا کئے اسی نے
دیکھا نہیں کسی نے　　چوپائے اور پرندے
ہے دور وہ سمجھ سے　　دنیا ہے یہ اسی کی
سمجھا کسی کسی نے　　ہم بھی اسی کے بندے
یہ دل کا فلسفہ ہے　　دیکھو تو ماجرا ہے
سب سے بڑا خدا ہے　　سب سے بڑا خدا ہے

(سب سے بڑا خدا ہے)

بچوں کو اگر ابتدا ہی سے علم دین کی تعلیم دی جائے تو یہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوتی ہیں ۔دینی تعلیم سے ہی بچے سلیقے مند زندگی بسر کرنے کے ساتھ خوش اخلاقی کے زیور سے بھی آراستہ ہوتے ہیں ۔ بچوں کو مذہب اور دین اسلام سے واقف کراتے ہوئے مختارؔ ٹونکی نے اپنی نظموں میں نماز اور قرآن کی عظمت کا ذکر کیا ہے ، مذہبی و دینی نظموں میں سورہ فاتحہ (منظوم اردو) نماز کی فضیلت ،قرآن کی شان ،عزم اور رمضان کا مہینہ وغیرہ قابل ہیں ۔نماز کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہر اک برے عمل سے بچاتی ہے اک نماز　　دنیا و آخرت کو بناتی ہے اک نماز
ہم نیکیوں کو پاتے ہیں بھر بھر کے جھولیاں　　ساری برائیوں کو مٹاتی ہے اک نماز
مردہ دلوں میں بھرتی ہے ایماں کی تازگی
تاریکیوں میں نور بہاتی ہے اک نماز

مختار ٹونکی کی نظموں میں قومی اور حب الوطنی کا جذبہ بھی موجود ہے۔ موجودہ دور میں ملک میں ہو رہے فسادات نے لوگوں کا چین وسکون چھین لیا ہے۔ ان سماجی اختلافات کو دور کرنے اور سماج میں امن و بھائی چارہ قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ''سندیش'' اور ''گاندھی'' اہم نظمیں ہیں۔ نظم 'سندیش' میں موصوف نے ملک میں امن وشانتی کا سندیش دیا ہے اور بچوں میں حب اوطنی کا جذبہ بھی بیدار کیا ہے۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

گاندھی کے گیت گائیں، گوتم کے گیت گائیں
دنیا کو امن کا یہ سندیش ہم سنائیں
سنسار والے سارے بھارت کو مان جائیں
ہم امن و شانتی کا ایسا سبق پڑھائیں
بھارت کا نام اونچا دنیا میں یوں اٹھائیں
گاندھی کے گیت گائیں، گوتم کے گیت گائیں
ناسمجھیوں سے پہلے برباد ہو چکے ہیں
برباد ہو چکے ہیں، ناشاد ہو چکے ہیں
آپس میں کیوں لڑیں ہم آزاد ہو چکے ہیں
بچھڑے ہوئے دلوں کو اک بار پھر ملائیں

اسی طرح ''دھنک تین رنگوں کی'' نظم میں بھی اپنے دیش کی شان ترنگے کی بہترین وضاحت کی ہے۔

نیچرل شاعری کی تحت مناظر فطرت، بہار کے موسم کی خوش نمائی اور خوبصورتی کا دلکش بیان کیا ہے۔ سردی کے موسم کا بیان ''سردی آئی'' اور ''سردی نامہ'' میں اور موسم کے بدلاؤ کا بیان ''موسمی بدلاؤ'' میں بڑے ہی سلیس انداز میں کیا ہے۔قدرت کی کاریگری پر اظہار نظم ''قدرت کا کارخانہ'' میں کیا ہے۔'پھولوں کا راجہ' اور ''پیڑ پودے انمول'' میں بھی انھوں نے نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔بچوں کو پیڑ پودوں کی اہمیت بتاتے ہوئے انھوں نے ان کی حفاظت کا بھی پیغام دیا ہے اور کہتے ہیں کہ:

خدا نے دیئے ہیں، یہ انمول تحفے　　بہت قیمتی ہیں، سبھی پیڑ پودے

حفاظت کریں ہم حفاظت کریں ہم

انہیں کی بدولت ہوائیں ہیں چلتی　　انہیں کی بدولت گھٹائیں ہیں چھاتی

حفاظت کریں ہم حفاظت کریں ہم

انہیں کی وجہ سے غذائیں ہیں ملتی　　انہیں کی وجہ سے دوائیں ہیں ملتی

حفاظت کریں ہم حفاظت کریں ہم

موصوف نے بچوں کے لئے لکھی ان نظموں کے ذریعہ بچوں میں محبت کا جذبہ پیدا کرنے، عداوت سے دور رہنے، وقت کی پابندی کرنے، حوصلہ ہمت اور بہادری وشجاعت کے کارنامے، گفتگو کے آداب، علم کی شمع کو روشن کرنے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو سنوارنے اور اعلی اخلاقی تعلیم کی نصیحت دی ہے تعلیم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ان اندھیروں کو مٹاؤ تو کوئی بات بنے　　علم کی شمع جلاؤ تو کوئی بات بنے

بڑھ کے دنیائے جہالت کی ہلا دو بنیاد　　پرچم علم اٹھاؤ تو کوئی بات بنے

پست ہمت نہ بنو، عزم وعمل دکھلاؤ　　علم سے خود کو سجاؤ تو کوئی بات بنے

اسی طرح سے ان کی ایک اور نظم میں وہ بچوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ

ڈریئے　　خدا کی ذات سے

بچیئے　　بری ہر بات سے
لڑیئے　　ہمیشہ ظلم سے
رہیئے　　الگ ہر جرم سے
رکھیئے　　نہ دل میں دشمنی
کیجئے　　سبھی سے دوستی
کہیئے　　وہی جو دل کہے
سنیئے　　وہی جو خوش لگے

موجودہ دور میں تعلیمی نصاب اتنا بڑھ گیا ہے کہ بچے اس کے بوجھ تلے دب گئے ہیں اسی دباؤ کے تحت ہر بچہ ذہنی طور پر تھک چکا ہے۔ ایک معصوم بچے کی فریاد (جو کتابوں کے بوجھ سے پریشان ہے) کو انھوں نے اپنی نظم معصوم دعا کے تحت بیان کیا ہے بچہ دعا میں کہتا ہے کہ:

چھوٹا مجھ سے ہلا گلا　　ہلکا کردے بستہ اللہ
مکتب کا ہے لمبا رستہ　　بھاری بھرکم میرا بستہ
ہو جاتی ہے حالت خستہ　　تھک جاتا ہوں میں تو اللہ

ہلکا کردے بستہ اللہ

بچے میں کسی بھی چیز کو دیکھ کر اس کو جاننے اور سمجھنے کا تجسس فطری ہوتا ہے جب وہ کسی انوکھی چیز کو دیکھتا ہے تو کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ جیسے سوالات کرتا ہے۔ بچے کی اسی جستجو کو مختار ٹونکی نے اپنی نظم ''الٹا پلٹا'' کاش'' اور آخر کیوں میں ظاہر کیا ہے۔

نیلا نیلا امبر کیوں ہے؟　　دھرتی کھاتی چکر کیوں ہے؟
بلی چوہے کیوں ہے کھاتی؟　　کالی کوئل کیوں ہے گاتی؟
کیوں پانی میں رہتی مچھلی؟　　کیوں چرخے پر گھومے تکلی؟

تتلی رنگ برنگی کیوں ہے؟ یہ دنیا بے ڈھنگی کیوں ہے؟

(آخر کیوں؟)

موصوف کا تعلق چونکہ درس و تدریس سے رہا ہے۔ تو انھوں نے اپنی نظموں سے ذریعہ بچوں کی ذہنی تربیت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے علم کے پیرائے میں بچوں کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ کھیل کھیل میں بچے جلدی سیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ منظوم طریقے پر یاد کئے گئے سبق ان کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔ ''کتابیں ، ،گھڑی ہے نام میرا'' دعوت عمل'' محنت سے جی لگاؤ''غیبت بری بلا ہے'' پہیلی'' ویری گڈ'' چھٹی نامہ''منظوم محاورے'' گنتی کا گیت''نوری پارے'' سال نو'' مکالمہ'' میں پاس ہو گیا ہوں'' میں فیل ہو گیا ہوں'' تقاضے'' مشورے'' سیکھو بھئی سیکھو'' اور گیند قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ان کی نظم گنتی کا گیت کا ایک بند ملاحظہ ہو:

کہتا سب سے نمبر ایک رب کے آگے ماتھا ٹیک

پھر بولے نمبر دو ہمت اپنی تو مت کھو

دیکھو کہتا نمبر تین سب سے اچھا میرا دین

خوش خبری لایا چار ہوگا سب کا بیڑا پار

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مختار ٹونکی نے ہلک پھلکے انداز کے ساتھ اپنی رواں دواں شاعری کے ذریعہ بچوں کو لبھایا ہی نہیں ہے بلکہ ان کو گدگدایا بھی ہے۔ اس میں وہ ان کی تربیت کرنے میں بھی کما حقہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اظہار خیال کے لیے انھوں نے بچوں کی زبان کا استعمال کیا ہے اور مشکل الفاظ سے پرہیز کیا ہے۔ اختر شیرانی کے بعد ٹونک میں انھوں نے ہی بچوں کے لیے طفلی شاعری کا گراں قدر سرمایہ پیش کیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ مجموعے میں شامل سبھی نظمیں پہلے ہی بچوں کے رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

﴿ ادب اطفال (نثر کے حوالے سے) ﴾

قصے یا کہانی سننا بچوں کا فطری شوق اور دلچسپی کا باعث ہوتا ہے اور وہ ہر قسم کے قصے اور کہانیاں بڑے

ہی شوق سے سنتے ہیں چاہے وہ اخلاقی ہوں، مذہبی ہوں، جاسوسی ہوں، سائنسی ہوں یا پھر مافوق الفطری عناصر میں سے ہوں یا پھر ہماری روزمرہ کی زندگی کے واقعات سے تعلق رکھتی ہوں۔

اخلاقی اور مذہبی کہانیاں بچوں کے لیے بہت اہم ہوتی ہیں یہ بچوں کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر کرتی ہے، اگر بچوں کو بچپن ہی سے مذہبی اور اخلاقی کہانیوں کے ذریعہ سچائی اور ایمان داری کی باتیں بتائی جائیں تو یہ ان کی کردار سازی میں معاون ثابت ہوتی ہیں جن کی وجہ سے بچے حقیقت پسندانہ باتیں سیکھتے ہیں۔ وہیں جاسوسی کہانیاں ان کے اندر ہمت وحوصلہ اور قربانی کے جذبہ کے ساتھ محنت اور لگن کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ان کہانیوں کے ذریعہ ہم بچوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیا کی تعلیم بھی دے سکتے ہیں۔

مختار صاحب نے جہاں اطفالی ادب میں اپنی شاعری سے اضافہ کیا ہے وہیں انھوں نے نثری ادب میں اپنے جوہر دکھایے ہیں۔ بچوں کے لیے دلچسپ اور حقائق پر مبنی ''سچی کہانیاں'' اور'' دیسی لوک کہانیاں' کے عنوان سے مختصر قصے لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے ان کی دلچسپی کے لیے چار جاسوسی ناول'' عیار عورت''، ''خونی غبارے''، ''ڈاکو نیلم''، اور ''پراسرار فقیر'' بھی لکھے ہیں۔

یہ کہانیاں بچوں کی تفریح سے ساتھ زندگی کی حقیقت سے بھی واقف کراتے ہیں۔بچپن کے دور میں ہی ان کے خیالات، فکر اور ذہن میں پختگی پیدا ہوتی ہے اس لیے بچوں کی تفریح کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی خیال رکھتے ہوئے عالم طفلی سے ہی ان کے لیے اس قسم کا نظم ہو جائے تو ان کی تربیت اور اصلاح کا کام کار گر ہوسکتا ہے۔

﴿ سچی کہانیاں ﴾

'' سچی کہانیوں'' کا مجموعہ ۲۰۱۶ء میں منظر عام پر آیا تھا یہ کہانیاں اگر چہ تخلیقی نہیں ہیں بلکہ یہ کہانیاں مذہبی واقعات پر مبنی اور تاریخی واقعات سے اخذ شدہ ہیں۔ بقول مختار ٹونکی صاحب:

> ''یہ کہانیاں آپ ہی سوچنے پر مجبور کر دیں گی، عقل وشعور کو بیدار کریں گی
> ، ہمت وحوصلہ پیدا کریں گی اور کامیاب زندگی کے گر سکھائیں گی''[۱۱]

ان کہانیوں کی بنیاد موصوف نے مذہب کے اہم قصوں، بزرگان دین کی زندگی کے حقیقی واقعات پر رکھی ہے۔ جو بچوں کے انفرادی وجود اور کردار سازی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس مجموعے میں چھوٹی چھوٹی ۵۴ کہانیاں پیش کی گئی ہیں جو کہ بچوں کی نفسیاتی ضرورتوں، ذاتی مسائل، فطری قابلیت اور صلاحیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت ہی آسان اور شستہ زبان میں لکھی گئی ہیں۔

یہ کہانیاں بچوں کو نبی کریم ﷺ صحابہ کرام، خلفائے راشدین، دین اسلام کے اعلیٰ مرتبت بزرگان دین جیسے خواجہ حسن بصریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، امام ابو حنیفہؒ وغیرہ کی سیرت اور اخلاقی اقدار سے روشناس کراتی ہے۔ ان کہانیوں میں شامل واقعات عربی و فارسی قصوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مختار صاحب کو عربی و فارسی زبان پر بھی عبور حاصل ہے انھوں نے یہ کہانیاں عربی و فارسی کی کتابوں سے اردو میں منتقل کی ہیں اور ان کی ان کہانیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ترجمہ نگاری کے فن میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔

ترجمہ نگاری کا فن بظاہر ایک مشکل فن ہے اور کسی بھی زبان کا ترجمہ کرنے کے لیے اس زبان پر مکمل طور پر عبور حاصل ہونا ضروری ہے۔ اس زبان کی تاریخ و تہذیب کے ساتھ ساتھ اس کی ساخت اور قواعد و ضوابط سے بھی واقفیت ہونا ضروری ہے نیز ترجمہ کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ ترجمہ کئے گئے مضمون کا اصل مفہوم و مقصد واضح ہو جائے۔

موصوف نے ''دعائے خیر'' کے عنوان سے گلستان سعدی کے فارسی قصے کا اردو میں نہایت سادہ زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جو کہ ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔

> ''درویش مستجاب الدعواۃ در بغداد بدید آمد۔ حجاج بن یوسف را خبر کرد۔ بخواندش و گفت مرا دعائے خیر کن۔ گفت خدایا جانش بستاں۔ گفت از بہر خدا این چہ دعا است؟ گفت ایں دعائے خیر است۔ ترا جملہ مسلماناں را۔ گفت چگونہ؟ گفت اگر بمیری خلق از عذاب تو ہر بند وتو از گناہاں

اے زبردست زیردست آزار　　گرم تا کہ بماند این بازار

بہ چہ کار آیدت جہاں داری　　مردنت نہ کہ مردم آزاری

سعدی شیرازی کی مندرجہ بالا حکایت کا ترجمہ مختار ٹونکی کی زبان میں درج ذیل ہے:

ترجمہ :۔ بغداد شریف میں ان دنوں ایک درویش کا بڑا چرچا تھا۔ حجاج بن یوسف ملاقات کا خواہش مند ہوا۔ درویش کو بلوایا گیا۔ حجاج نے ان کی خدمات میں درخواست کی۔ ''اے درویش! میرے حق میں دعائے خیر کر'' درویش نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیے اور با آواز بلند کہا کہ اے خدا تو اسے موت دے حجاج نے گھبرا کر کہا کہ اے درویش یہ کیا دعا ہوئی؟ یہ دعائے خیر ہے تیرے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی کہ اس طرح تو ظلم کرنے سے چھوٹ جائے گا اور دوسرے تیرے ظلم سے چھوٹ جائیں گے۔ درویش نے اطمئنان سے جواب دیا۔[۱۲]

''ایثار'' ایک سبق آموز قصہ ہے۔ جس میں دوسرے کے فائدے کو اپنے فائدے پر ترجیح دینے کے عمل کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی کے ذریعہ موصوف نے بچوں کو دوسرے کی بہتری اور بھلائی کرنے کی نصیحت کی ہے۔ کیونکہ خودغرضی سے بہت نقصان بھی ہیں اور جب بچہ اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضروریات کو مقدم رکھے گا تو اس کے اخلاق میں درستی آئے گی۔

قصہ :۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ ایک رات کسی غیر آباد مسجد میں گئے۔ مسجد کے دروازے پر کواڑ نہ تھے آپ نے دیکھا کہ تین درویش وہاں پر سوئے ہوئے ہیں بہت سخت سردی تھی آپ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور صبح تک یوں ہی کھڑے رہے۔ جب وہ درویش نیند سے بیدار ہوئے اور یہ ماجرہ دیکھا تو ان سے پوچھ بیٹھے کہ حضرت آپ نے ایسا کیوں کیا؟

آپ نے فوراً جواب دیا کہ'' ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور آپ لوگ سو رہے تھے میں نے سوچا کہ دروازے میں آڑ بن جاؤں تا کہ آپ لوگوں کو سرد ہوا نہ ستائے۔''[۱۳]

عربی قصہ :۔ قرآن کی عظمت کے عنوان سے بے حد دلکش انداز میں دینی اور روحانی تربیت کے

لئے صدق دل وخلوص نیت کے ساتھ بڑے مؤثر پیرائے میں تلقین کی ہے۔

ایک موقع پر ہمارے نبی ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص پریشانی کے عالم میں ہے اور کوئی چیز تلاش کرتا پھر رہا ہے۔آپ نے اسے بلا کر دریافت کیا کہ کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ شاید کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی ہے جس کی تم تلاش میں ہو؟

ہاں حضور ! میرا اونٹ کہیں کھو گیا ہے۔اس شخص نے کہا'' آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ'' ارے اتنی سی بات !میں نے یہ سمجھا کہ تمہیں قرآن شریف کی کوئی آیت یاد تھی جس کو تم بھول گئے ہو۔''

اسی طرح سے شرم کا لحاظ، گرہن کی حقیقت، مومن کی پہچان اور دنیا کی باتیں ان قصوں میں آپ کی عظمت کی نصیحت آموز حکایتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح سے'' امیر المومنین اور عوام'' میں خلیفہ حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے۔جس میں امانت میں خیانت نہ کرنے کی صلاح دی گئی ہے۔ وہیں'' گھاٹے کا سبب'' میں تجارت میں نیکی اور ایمان داری سے کام لینے کی بات کہی گئی ہے۔

اس مختصر سے مجموعے میں پند ونصیحت کی ۵۴ کہانیاں شامل ہے جو بچوں میں اخلاق و عادات کی درستگی کے ساتھ خامیوں اور کمیوں کو دور کرنے میں کارگر ہیں۔ بقول مختار ٹونکی:

'' ان میں انسانی قدروں کی ایک روح دوڑتی ہوئی ملے گی۔''

یہ انسانی قدروں سے سرشار کہانیاں بچوں میں انسانیت کو جذبہ قائم رکھنے کے ساتھ انھیں نیک اور سچا انسان بنانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

﴿ دیسی لوگ کہانیاں ﴾

بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا آسان ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل بھی ہے کیونکہ بچوں کے لیے لکھتے وقت ان کی جبلی صلاحیتوں، نفسیاتی تقاضوں اور فطری عادات سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ بچوں کی ضرورت کے مطابق ادب تخلیق کرنے کے ساتھ بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے دنیا کے کونے کونے کی حقیقی

کہانیوں سے بھی روشناس کرانا ضروری ہے تا کہ بچوں کو ان سے آ گاہی حاصل ہو سکے۔ اچھی اور عمدہ کتابیں بچوں کی زندگی کو سنوارنے میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ کتابیں ہی ان کی زندگی کے متعلق کارآمد اور اچھی باتیں بتانے اور سکھانے کا بہترین وسیلہ ہیں۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور اس کے ہر صوبے کی ایک الگ پہچان وا لگ تہذیب ہے۔ ہر صوبے میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر زبان میں ان کی الگ الگ لوک کتھائیں ہوتی ہیں۔ جو اس کو دوسرے صوبوں سے الگ کرتی ہیں۔

مختار ٹونکی نے بچوں کی شاعری اور حقیقی واقعات پر مبنی کہانیوں کے علاوہ بچوں کے مسائل پر غور کرتے ہوئے ملک کے مختلف علاقوں کی لوگ کتھاؤں کو یکجا کر کے ایک مختصر سا مجموعہ بچوں کی نذر کیا ہے۔ یہ مجموعہ ''دیسی لوک کہانیاں'' کے عنوان سے ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ جس میں چھوٹی بڑی تقریباً ۱۳ لوک کتھائیں شامل ہیں۔

اس کتاب میں شامل تمام ہی کہانیوں میں بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی نصیحت موجود ہے۔ موصوف اپنی اس کتاب میں لوک کتھاؤں کے تعلق سے ''پہلی بات'' کے تحت یوں رقم طراز ہیں کہ:

> ''لوک گیتوں کی طرح لوک کتھائیں بھی ہماری تہذیب و معاشرت کا حصہ ہیں اور ایسا قابل قدر ورثہ ہیں۔ جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ لوک کتھائیں ایک طرح سے عوامی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اور یہ ہر ایک ملک اور قوم میں پائی جاتی ہیں ان کی مکتوبی شکل (تحریری شکل) تو نہیں ہوتی لیکن یہ نسل در نسل اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے ان کی دنیا بہت وسیع ہے اور یہ اتنی پر تاثر ہوتی ہیں ذہن و دل پر نقش ہوتی جاتی ہیں اور سمجھ بوجھ ،عقل و شعور کے نئے نئے دروازے کھولتی ہیں۔ اگر ان پر دھیان دیا جائے تو یہ کامیاب زندگی کا گر سکھاتی، ہمت و حوصلہ پیدا کرتی ہیں، دانائی و عقل مندی

کا سبق دیتی ہیں سچائی اور ایمان داری کی راہ استوار کرتی ہیں، پیار و محبت کے
جذبات کو ابھارتی ہیں مختصر یہ کہ ایک اچھا انسان بناتی ہیں''۔

دیسی لوک کہانیاں ادب اطفال میں ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ یہ کہانیاں سچائی ، ایمان داری، عقل مندی، بہادری، محنت اور سمجھ داری کے ساتھ کام کرنے کی نصیحت کرتی ہیں ۔

موصوف نے سبھی کہانیاں دلچسپ اور نصیحت آمیز انداز میں بیان کی ہیں جن کو پڑھ کر بچے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے بلکہ بڑے بھی شوق اور دلچسپی کے ساتھ ان کو پڑھ کر اور لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات کو دھیان میں رکھ کر ان کے لیے کہانیاں اور لوک کتھاؤں کا انتخاب کیا ہے ۔

کتاب کی پہلی کہانی ''بہت گئی تھوڑی رہی'' کے عنوان سے ہے ۔ اس کہانی میں نٹوں کے ایک منڈلی گجرات کی راجدھانی میں اپنا پروگرام کرنے آتی ہے ۔ آدھی رات کو جب نرتکی کا رقص چلتا ہے وہ ناچتے ناچتے تھک جاتی ہے تب منڈلی کا مکھیا اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ایک دوہا بولتا ہے :

بہت گئی تھوڑی رہی ہمت سے لے کام　　بات سمجھ کر سندری مت کر ابھی آرام

(موصوف اپنی تحریروں میں ملی جلی زبان کا استعمال کرتے ہیں یہاں انھوں نے اس دوہے میں ہندی لفظ کو جوں کو توں رکھا ہے)

یہ دوہا سن کر نہ صرف سندری کو جوش آجاتا ہے بلکہ وہاں پر موجود سادھو جو کہ دنیا کا لطف لینا چاہتا ہے اس کا سنیاس بچ جاتا ہے ۔ اور بیوپاری کا بیٹا جو پڑھا لکھا نہ ہونے کے سبب دوہا کو سمجھ نہیں پاتا ہے اور دو بیوپاری کی چوٹی کاٹ دیتا ہے اس کی گردن بچ جاتی ہے ۔ اور انگر سیٹھ کی پتنی کا دھرم بچ جاتا ہے جو اپنے پتی کا انتظار کر کے امید چھوڑ دیتی ہے اور وہاں پر موجود راجہ کی جان بچ جاتی ہے کیونکہ اس کا بیٹا اس کو قتل کرنے کی سازش کرتا ہے ۔ اس طرح ایک دوہا جو صرف نرتکی کے حوصلہ افزائی کے لیے بولا جاتا ہے وہاں موجود سبھی لوگوں کا حوصلہ بڑھا دیتا ہے ۔ اس کہانی میں بچوں کے اندر حوصلہ افزائی کے ساتھ کسی کام کو نامکمل نہ چھوڑنے کی صلاح دی گئی ہے ۔

جیت میں ہار :۔ یہ ایک سبق آموز کہانی ہے۔ جو ایسے پنڈت کی کہانی ہے جو کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھر لوٹتے وقت راستے میں ٹھگ لیا جاتا ہے۔ اس کہانی کے ذریعہ بچوں کو بتایا گیا ہے کہ کتابی علم کا حاصل کرنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ زندگی کا تجربہ بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔

جادوئی منتر :۔ کہانی بچوں کو لالچ نہ کرنے کی طرف ترغیب دلاتی ہے۔ لالچ بری بلا ہے اس سے نہ صرف ہم کو بلکہ ہمارے آس پاس کے لوگوں کو بھی نقصان ہوتا ہے۔ زیادہ لالچ کرنے سے ہم کو اس کی بڑی قیمت چکانی پڑ جاتی ہے۔

بیٹی کی سمجھداری :۔ بلاس پور کے ایک غریب کسان کی کہانی ہے۔ جو قرض میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کی بیٹی اپنی سمجھ داری اور عقل مندی سے نہ صرف اپنا قرض معاف کرواتی ہے بلکہ زمیں دار سے اپنی جان بھی بچا لیتی ہے یہ کہانی بچوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ عقل مندی ہر پریشانی سے نجات دلاتی ہے۔

سچے دوست :۔ دوستوں کی جذباتی کہانی ہے جس میں ایک دوست اپنے دوسرے دوست کی جان بچانے کے لیے اپنی جان کی بھی پروانہیں کرتا ہے۔ اور اپنے دوست کی جگہ پر سزا پانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی سچی دوستی کی مثال ہے۔ جو دوسروں کے لیے اور خصوصی طور پر دوستوں کے لیے ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

ان کے علاوہ قسمت کا پتھر، ہوشیار رہو، مورتی کی سیکھ، کسان کے بیٹے، گدھے کا دان، فیولی، عقل مند جولاہا، ففٹی ففٹی جیسی سبھی لوک کتھائیں نہ صرف بچوں کو نصیحت اور پیغام دیتی ہیں بلکہ پڑھنے میں بھی دلچسپ اور مزے دار ہیں یہ کتابیں بچوں کو زندگی جینے کا گر سکھاتی ہیں۔

جاسوسی ناولٹ :۔ مختارؔ ٹونکی نثر و نظم کے ساتھ ساتھ ناول نگاری کے فن سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ موصوف نے بچوں کی نفسیاتی کیفیات، جبلی خواہشات وصلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہایت دلچسپ پر لطف اور سادہ انداز میں جاسوسی ناولٹ بھی لکھے ہیں۔

اب تک ان کے چار جاسوسی ناولٹ منظر عام پر آچکے ہیں ان میں ''عیار عورت'' ۲۰۱۲ء میں ''خونی

غبارے''، ''ڈاکونیلم''، ''پراسرارفقیر'' ۲۰۱۳ء میں رحمانی پبلیکشن کے زیراہتمام منظرعام پرآئے۔

مختارٹونکی نے یہ ناول بچوں کی دلچسپی ان کے معیاراوران کی سمجھنے کی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھے ہیں۔ جوکہ ادب اطفال میں گراں قدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ناول بچوں کے اندر سراغ رسانی اورجستجو کا مادہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ان کے سبھی ناولوں کے پلاٹ سادہ ہیں۔جن پر بچوں کا تجسس اول سے لے کرآخر قایم رہتا ہے۔ان ناولوں کے پلاٹ،منظرنگاری، مکالمہ نگاری سبھی کچھ موقع کی مناسبت سے لکھے گئے ہیں۔

''عیارعورت'' ایک دلچسپ ناول ہے جوکہ ایشیاء کی مشہور مجرمہ گریٹا کی کہانی پرمبنی ہے۔ جوشادی کر کے ٹھگنے کا کام کرتی ہے گریٹا عرف کملاوتی سیٹھ پرہلاد داس سے دوسری شادی کرتی ہے۔کملاوتی کے پہلے شوہر کا قتل ہو چکا ہے۔ وہ اپنے ایک دوست جے پال کے ساتھ مل کرسیٹھ پرہلاد داس کوٹھگتی ہے۔ناول کا پلاٹ مندرجہ ذیل ہے:

سیٹھ جی کے گھر میں آگ لگ جاتی ہےاورالماری سےان کے قیمتی زیوراوررقم چوری ہوجاتے ہیں۔ تواس واردات کی تفتیش کے لئے مشہور جاسوس امجد کی خدمات لی جاتی ہیں۔ جواپنی فنکارانہ طبیعت اورتکنیک سے سیٹھ جی بیوی کملاوتی سے پیچیدہ سوالات کرتا ہے۔جن کے جواب وہ نہیں دے پاتی اورآخر میں اپنا جرم قبول کرلیتی ہے۔

ناول کا پلاٹ سادہ ہے۔جس میں ابتدا سے آخرتک سراغ رساں واردات کی تفتیش بڑی گہرائی سے کرتا ہےاور ہرواقعہ کی تحقیق بڑے ہی سنسنی خیزانداز سے کی گئی ہے۔ناول میں معمولی واقعات میں بھی پیچیدگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔موصوف نے بڑے فنکارانہ اندازاورمہارت سے تمام واقعات میں ربط وتسلسل پیدا کیا ہے۔ ناول کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ایک معصوم بچے کی زبانی سنائی جارہی ہے جوکہ سراغ رساں امجد کا فرزند ہے۔

موصوف کے تمام ہی ناول سادہ اورآسان زبان میں پیش کئے ہیں۔جن میں واقعات کی ہم آہنگی

،مکالموں کا تال میل، ضبط واصول اور کہیں کہیں ڈرامائی انداز میں تعجب، جستجو تمام ہی کیفیات میں بڑی چابک دستی سے کام لیا ہے۔

ناول ڈاکو نیلم صداقت اور ایمان داری کا پیغام دیتا ہے۔اس ناول کی کہانی ایک چھوٹے سے شہر کرشن نگر کی ہے جس کی پرسکون فضا میں اچانک ڈاکوؤں کا خوف ہو جاتا ہے۔ڈاکو نیلم وہاں کے راجہ کے خزانے لوٹنے کی دھمکی دیتا ہے اور کڑی حفاظت کے باوجود وہ راجہ کا بیش قیمتی ہار چرا لیتا ہے۔جس کی خبر راجہ کو بھی نہ تھی۔ناول کے ہر واقعہ میں دلچسپ اور حیرت انگیز مناظر موجود ہیں۔موصوف نے اس کے واقعات کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ قاری کا ذہن پوری طرح سے ان کی گرفت میں رہتا ہے۔جس میں موصوف پورے طور پر کامیاب ہیں۔

راجہ اپنے سپاہیوں اور وزیر کے ساتھ خزانے کے تلاش میں جاتا ہے۔راستے میں آنے والی دشواریوں کا سامنا کرتے ہوئے خزانے کی پہیلیوں کو بڑی ہی ہنرمندی کے ساتھ سلجھاتا ہے۔اس ناول میں مختار صاحب نے منظر نگاری میں بھی اپنے کمال کا اظہار کیا ہے۔جس کی مثال مندرجہ ذیل ہے:

''ابھی رات کے نو ہی بجے ہیں لیکن چاروں طرف گہرا سناٹا طاری ہو گیا ہے۔مطلع ابر آلود ہے۔گھٹائیں برسنے کو تیار کھڑی ہیں۔گھور اندھیرا ہے راجہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔اچانک وہ چونک پڑا اخوف سے کھاتے کھاتے ہاتھ رک گئے وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا نیلم الماری کے پیچھے سے پستول لئے برآمد ہوا تھا۔نیلم نے یہ دیکھ کے مسکراتے ہوئے کہا۔''بیٹھئے بیٹھئے! میں آپ کو نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں آیا ہوں۔''

کرشن نگر کی خوبصورتی کا منظر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

کرشن نگر ویسے تو چھوٹا سا شہر تھا لیکن اس کی چھوٹی چھوٹی خوبصورت پہاڑیاں میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے جھرنے اور جھیلیں، ناگن کی طرح سے بل کھاتی ہوئی سبک رفتار ندی، لہلہاتے ہوئے کھیت، حسین پر فضا باغات اور دوسرے قدرتی مناظر کی کچھ ایسی

خوبیاں تھیں کہ دوسرے شہروں کے لوگ بھی یہاں پر کھینچے چلے آتے تھے۔''

ناول کا اختتام انھوں نے بڑے ہی دل پذیر انداز سے کیا ہے۔ جب راجہ کا منتری اس کو دھوکہ دیتا ہے اور ڈاکو نیلم جو کہ اپنا روپ بدل کر ان کے ساتھ رہتا ہے منتری سے راجہ کی جان بچاتا ہے اور اسی کے ساتھ ہی سچائی، نیکی اور ایمان داری کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ راجہ اس کی ایمان داری سے خوش ہو کر اس کی شادی راج کماری سے کر دیتا ہے۔

جزئیات نگاری کے فن میں بھی مختار ٹونکی کو عبور حاصل ہے۔ ان کی فن کاری اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی سنسنی خیز انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سارا کا سارا منظر قاری کی نگاہوں میں جیتا جاگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ''خونی غبارے'' ناول میں کیپٹن آصف اور کیپٹن فیاض کیمیکل سے بھرے ہوئے خونی غبارے سے ہو رہے قتل کی تحقیق کرتے ہیں۔ ان کی اس کتاب پر ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے اپنی کتاب ادبی جائزے میں اس طرح تبصرہ کیا ہے:

> ''مختار صاحب کی یہ کہانی دلچسپ تو ہے ہی۔ اس کے ساتھ جاسوسی کے گر بھی سکھاتی سکھاتی ہے ڈرامائی انداز، مکالموں کی ادائیگی، پلاٹ کی جاذبیت اور کہانی پن کا منفرد انداز ان کے اعلیٰ فن کار ہونے کی دلیل ہے۔ کہانی کے پلاٹ میں کہیں کوئی جھول نہیں ہے۔ کردار خود بخود اپنے عمل سے ناول کے قصے کو آگے بڑھاتے ہیں بناوٹ کو کہیں کوئی شائبہ نہیں ہے'' [۱۴]

اس کے علاوہ ناول ''پراسرار فقیر'' واحد متکلم کے صیغے میں لکھا گیا ہے۔ جس میں سراغ رساں قادری فقیر کے بھیس میں بلیک میلر کو گرفتار کرتا ہے۔ اس کہانی کو انسپکٹر قادری کے بیٹے کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔ جو خود بھی پراسرار فقیر کو دیکھ کر اس کی تفتیش میں لگ جاتا ہے اور بڑی بہادری اور ہمت کے ساتھ اکیلا ہی مجرموں کا پیچھا کرتے ہوئے چلا جاتا ہے۔ ناول جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے واقعے پر سے پردہ ہٹتا جاتا ہے۔ ناول میں پلاٹ کے انوکھے پن کے ساتھ منظر نگاری، جزئیات نگاری اور جذبات نگاری کی عکاسی بڑی ہی

خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ چاروں ناولٹ ویسے تو ان کی تخلیقی ذہن کی پیداوار ہیں۔مگر جس طرح سے انھوں نے پلاٹ ترتیب دئے ہیں اور واقعات سے تجسس کو ابھارا ہے۔اس کے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو کے بلند پایہ جاسوسی ناول نگار ابن صفی سے بہت متاثر ہیں۔ وہ برابر اس میں اضافے کررہے ہیں اردو کے بچوں کے رسائل میں وہ برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ناگپور کے ڈاکٹر اشفاق احمد نے بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ڈائرکٹری مرتب کی ہے۔جس میں مختار ٹونکی کا ذکر بھی بڑے طمطراق سے کیا ہے۔ بلا شبہ راجستھان میں ان جیسا بچوں کا ادیب نہیں۔

اردو اکادمی دہلی نے بچوں کے ادب پر جو سیمینار منعقد کیا تھا۔اس میں ان کو مدعو کیا گیا تھا۔جس سے ان کی بلند قامتی ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ ان دنوں بچوں کے لیے ایک کتاب ''امیر خان دوسرا ٹیپو سلطان'' ترتیب دے چکے ہیں۔جو جلد ہی شائع ہوگی۔اس کے علاوہ ایک کتاب ''عبدالرحیم خان خاناں'' پر بھی ترتیب دے چکے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں تاریخی حیثیت کی حامل ہیں جو بچوں کو ایک نئی جہت سے روشناس کرائیں گی۔

☆ ☆ ☆

﴿حوالہ جات باب پنجم﴾

۱۔ ادب کا مطالعہ از اطہر پرویز ص ۳۳ ۱۹۸۶ء

۲۔ مغربی بنگال اور بچوں کا ادب عاصم شہنواز شبلی ص ۱۳

۳۔ اقبال اور بچوں کا ادب زیب النساء بیگم ص ۱۵

۴۔ اردو میں بچوں کا ادب ڈاکٹر خوشحال زیدی ص ۲۸

۵۔ اردو میں بچوں کا ادب از خوشحال زیدی ص ۲۶

۶۔ اردو میں بچوں کا ادب از خوشحال زیدی ص ۲۶

۷۔ فکر پارہ پارہ مختار ٹونکی ص ۳۵۴

۸۔ اردو میں بچوں کا ادب از خوشحال زیدی ص ۱۶۰

۹۔ بچوں کا ادب ضرورت اور اہمیت ماہنامہ پیش رفت ستمبر ۲۰۱۹ء ص ۱۱

۱۰۔ بچوں کا ادب رسائل و جرائد کے حوالے سے ماہنامہ پیش رفت دسمبر ۲۰۱۹ء ص ۲۴

۱۱۔ سچی کہانیاں پہلی بات مختار ٹونکی ص ۳ ۲۰۱۶ء

۱۲۔ گلہائے فارسی حکایت ۲۹ ص ۱۲

۱۳۔ گلہائے فارسی حکایت ۵۲ ص ۴۶

۱۴۔ ادبی جائزے ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی ص ۱۲۶

☆☆☆

باب ششم

ماحصل

ما حصل

ہندی زبان میں ٹونک لفظ کے معنی ہیں نوک دار پہاڑی کے ہیں اور اس نوک دار پہاڑی پر جو آبادی بسی اس کو ٹونکرا کے نام سے موسوم کیا گیا۔ دہلی کے راجہ کا بھائی مٹن پال تنورا اپنے بھائی سے اختلاف ہونے کے وجہ سے ناراض ہو کر ۱۰۰۳ء ٹونک آ گیا تھا اور وہاں پر کچھ عرصے تک قیام بھی کیا تھا۔ اختلاف ختم ہونے کے بعد اپنے بھائی کے بلانے پر وہ یہ علاقہ اپنے ملازم رام سنگھ کے حوالے کر کے اور اس کو آباد کرنے کی اجازت دے کر وہ دہلی چلا آیا۔ رام سنگھ نے ٹیکری پہاڑ کے دامن میں ایک قصبہ بسایا اور اس کا نام اس نے ٹونکرا رکھا۔ جو کہ موجودہ وقت میں ٹونک کے نام سے جانا جاتا ہے اور راجستھان کا ایک ضلع شمار ہوتا ہے۔

ابتدا میں یہ علاقہ منن پال کے اختیار میں رہا۔ اس کے بعد پھر یہاں پر چوہانوں اقتدار ہو گیا اور یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا۔

۱۳۵۶ء سمبت بکرمی میں جب یہاں پر علاؤالدین خلجی کا دور تھا۔ تو اس وقت یہاں پر مہندواس نے ٹونک کی آبادی بڑھانے کے لیے توجہ کی۔ ۱۳۵۹ء سمبت وکرمی میں کیلن دیو کے بیٹے پاتا جی نے اپنے ہی بھائی کو قتل کر کے حکومت کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اسی سلسلے میں آگے چل کر راؤ ڈونگر جی کا بڑا لڑکا راؤ رتن توڑا کا حکمراں بنا تو پھر اس نے یہاں پر ۱۵۳۵ء سمبت وکرمی میں کوٹ اور محلات کی تعمیر کروائی جب کہ اس کا چھوٹا لڑکا جوگا دیت اس ٹونکرے پر قابض ہوا۔ ٹونک پر قابض ہونے والے حکمرانوں میں ناتھا جی، کھیم راج، مہند داس مان سنگھ، گیتا جی اور سرجن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سمبت ۱۵۷۵ء وکرمی میں راؤ رتن کا خاندان اس علاقے پر قابض ہوا جس میں پرتھوی راج، گمان جی رام چندر جی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۶۵۲ء وکرمی میں عہد اکبری میں راجہ مان سنگھ نے یہاں کے تمام پرگنے اپنی زیر نگرانی کر لیا اور اس کے بعد راؤ سنگھ سسودیہ سوئم کے عہد میں بھولا ناتھ نے آس پاس کے بارہ گاؤں ویران کر کے اس علاقے کو

ٹونک کے نام سے بسایا اس کے بعد اس شہر کو جے پور کے حکمراں سوائی جے سنگھ اور مان سنگھ نے اس کو سولنکی راجہ کے حوالے کر دیا۔ عہد دولت برطانیہ میں یہ علاقہ انگریزوں نے فتح کر کے اس کو جے پور ریاست کے حوالے کر دیا۔

۱۸۱۷ء میں جب نواب امیر خان نے اس علاقے پر اپنا تسلط قائم کیا تو باضابطہ ایک ریاست کی تشکیل کی گئی اور پھر اس کے بعد شروع ہوتا ہے اس ریاست کی تعمیر اور ترقی کا دور۔ جس میں نواب ابراہیم خاں کا دور ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ان کے اس دور میں تعمیری، تعلیمی، ادبی ماحول سازگار رہا اور نوابان ٹونک کی علم دوستی اور ادب نوازی بھی قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو ادب اور اردو زبان کی ترقی یہاں کے حکمرانوں کی مرہون منت ہے جس کی وجہ سے یہاں پر علم و ادب کے چراغ ہمیشہ ہی روشن رہے اور اس سلسلے میں سید احمد شہید اور پھر غدر کے سانحے کے بعد ملک میں جو افراتفری کا عالم تھا۔ ان حالات میں دہلی اور لکھنو سے متعدد اہل علم حضرات یہاں پر تشریف لائے تھے ان کے ذریعہ بھی یہاں پر ایک ادبی ماحول بنا اور متعدد مشاعرے اور ادبی محافل کا انعقاد ہونے لگا۔ منشی بساون لال شاداںؔ، فقیر محمد گویاؔ جیسی معروف ادبی شخصیات یہاں پر موجود تھیں۔ ایسے ماحول میں جہاں مشاعرے اور ادبی محافل کا زور تھا۔ ان ادبی محافل اور مشاعرے میں جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مراد آبادی، ساغرؔ نظامی، ماہرؔ القادری، غلامؔ ربانی تاباں جیسے معروف شعرائے کرام یہاں پر آتے تھے اور یہاں کی ادبی فضا کو مہکاتے اور گرماتے تھے۔ ان ہی لوگوں کے روشن کئے ادبی چراغ تا حال اپنی روشنی سے لوگوں کے ذہن و دماغ کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے اخلاف مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی اس ادبی امانت کے بھی امین بنے ہوئے ہیں۔ مختارؔ ٹونکی بھی ان ہی وارثین میں سے ایک ہیں۔

عصر حاضر میں مختارؔ ٹونکی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے جو کہ ٹونک ہی کے ادبی ماحول کی پروردہ ہے اور اس کی امین بھی ہے۔ چونکہ ان کا خمیر بھی اسی ٹونک کی ادبی مٹی سے بنا تھا اس لیے انھوں نے اس ادب کی وراثت کو مختلف پہلوؤں سے زندہ رکھا ہے۔ خواہ وہ شاعری ہو یا پھر نثر کا میدان، تنقید ہو یا پھر تحقیق،

خاکہ نگاری ہو یا انشائیہ نگاری، افسانہ نگاری ہو ناول نگاری، طنز مزاح نگاری ہو یا پھر ان کی ہی ایجاد کردہ نئی صنف طنشائیہ نگاری۔ ان تمام ہی میدانوں میں انھوں نے اپنے فطری میلان اور مخصوص افتادطبع کی آمیزش سے ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے۔ اسی طرح سے انھوں نے طنز و مزاح کی چاشنی میں سماجی، سیاسی، معاشی غرض ہر قسم کے موضوعات پر قلم اٹھا کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر چہ ان کی نثر کے معاملے میں شاعری کا ذخیرہ کم ہی ہے لیکن جو کچھ بھی انھوں نے کہا ہے وہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ ان کی غزلیں کلاسیکی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ جن کا اسلوب وطرز ادائیگی دلکش انداز میں ہے۔ اگر دیکھا جائے تو مختارؔ ٹونکی کی ادبی خدمات اردو ادب کے ذخیرے میں اہم اضافہ ہیں۔

مختارؔ ٹونکی صاحب نہ صرف ایک انشاء پرداز، افسانہ نگار، طنز و مزاح نگار اور ایک شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں بلکہ اطفالی ادب میں (جو آج کے دور کی اہم ضرروت ہے جو بچوں پر ہو رہے نصابی حملے کے ساتھ الیکٹرونک وبا کی وجہ کہیں گم سا ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں بچے ذہنی طور پر پریشان رہتے ہیں) میں بھی انھوں اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے۔ چونکہ وہ خود ایک مدرس کے عہدے پر کام کر چکے ہیں اس لئے وہ بچوں کی ذہنیت اور نفسیات کا بخوبی علم رکھتے ہیں اسی مناسبت سے انھوں نے بچوں کے ادب پر بہترین کام بھی کیا ہے۔ جس کے تحت انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں، کہانیاں، ناولٹ وغیرہ لکھے جو کہ بچوں کے لیے دلچسپی کا باعث نیز ان میں اخلاق کی تعمیر کا جذبہ بھی ابھارنے کے کوشش کی ہے۔

مختارؔ ٹونکی کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے طالب علمی کے زمانے ہی سے ہو گیا تھا۔ جب ان کی پہلی ادبی کاوش ''ہفتہ وار آئینہ'' میں ''بدحواسی'' کے عنوان سے ۲۳/جنوری ۱۹۵۶ء کو منظر عام پر آئی تھی۔ چونکہ ٹونک کی ادبی فضا بھی تھی اور موصوف کا مزاج اور ذوق بھی تھا تو اس جانب جھکاؤ لازمی تھا گر چہ یہ جھکاؤ کچھ مدت کے بعد ہوا جب وہ ملازمت میں آئے اور پھر ان کے قلم میں جو روانی آئی وہ تا حال جاری ہے۔ مذکورہ سطور میں اس بات کی نشاندہی کی جا چکی ہے کہ مختارؔ ٹونکی کی مزاج شاعری کے مقابلے میں نثر کی طرف زیادہ مائل تھے۔ لہٰذا ان کی ادبی خدمات نثر کے میدان ہی میں نظر آتی ہیں خاص طور پر طنز و مزاح کے میدان میں

ان کے کارنامے بہت خوب ہیں اس سلسلے میں ان کے پانچ مجموعے بھی منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں اس کے علاوہ ان کی اپنی ہی ایجاد کردہ نئی ادبی صنف طنشائیہ بھی ہے جس کو انھوں نے طنز اور انشائیہ کی آمیزش کر کے پیش کیا ہے۔طنز و مزاح کے علاوہ مختار صاحب نے انشائیہ، افسانہ، خاکہ اور تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھلائے ہیں۔انھوں نے اپنی نثر میں عہد جدید کے فکر تقاضے اور جد و جہد کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اسی کے تحت انھوں نے سماج اور معاشرے میں ان پہلوؤں کا اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جن پہلوؤں سے سماج نے ہمیشہ بچنے کی کوشش کی ہے۔ان کی تحریروں میں جہاں سلاست، روانی اور عام فہمی ہے وہیں پر طرز تحریر میں مقفیٰ و مسجع طرز تحریر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر ان کی تحریر کا یہ حصہ اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے۔

''مردہ پرستی بھی فرقہ پرستی کی طرح ہر جگہ ہمارے دیش میں یہاں وہاں موجود ہے۔ اور اسی سے روشن ہمارا چراغ ہست و بود ہے۔ہمارے ملک والے تو اس معاملے میں اتنے جیالے ہیں کہ گوڈسے بن کر گاندھی کو گولی سے اڑا دیتے ہیں اور بعد از مرگ اسے راشٹر پتا کہہ کر باپو بنا لیتے ہیں۔آپ کبھی راج گھاٹ جائیں اور کچھ دیر وہاں ٹھہر جائیں تو آپ کو پتہ چلے کہ دیش کیا ودیشوں کی بڑی بڑی ہستیاں بھی وہاں آتی ہیں اور بصد بحد ادب کہتی ہیں''۔

سمادھی پہ باپو تری آج میں بھی عقیدت سے لایا ہوں پھولوں کی مالا
کہ تو ہی تھا وہ مرد آزاد جس نے غلامی کے پھندے سے ہم کو نکالا

نثر نگاری کے علاوہ مختار ٹونکی نے میدان شاعری میں بھی اپنا لوہا منوالیا ہے۔چونکہ انھوں نے ٹونک کی دلکش شاعرانہ ادبی فضا میں تربیت پائی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک شخص جس ماحول اور فضا میں سانس لیتا ہے اسی ماحول اور فضا کا عکس اس کے کام اور فکر و نظر میں نظر آتا ہے اور یہی اثرات ان کی شاعری میں بھی

خوب دیکھنے کو ملتے ہیں۔

انھوں نے شاعری میں اپنے رجحانات، تجربات اور مشاہدات کا بھی اظہار کھل کر کیا ہے۔ ان کی شاعری ایک پیغام دیتی ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی حقیقتوں کا عکس بخوبی نظر آتا ہے۔ زندگی کے حقائق اور سچائیوں کو بیان کرتے ہوئے ان کے یہ اشعار۔

میرے سر پر کوئی تو سایہ ہو　　دھوپ کا ہی تو سائباں رکھ دے
عمر بھر اعتبار کر لوں گا　　دل میں جھوٹی تسلیاں رکھ دے

بجلیوں سے مقابلہ ہے ترا
ڈالی ڈالی پہ آشیاں رکھ دے

غزلیات کے علاوہ مختار صاحب کا نام راجستھان میں ماہیہ نگار کے طور پر بھی جانا جاتا ہے ۔انھوں نے راجستھان میں ماہیہ نگاری میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے درست وزن اور بحر میں بہت عمدہ ماہیہ کہے ہیں جیسے مندرجہ ذیل یہ ماہیے:

آکاش میں تارے ہیں　　خورشید کی سختی پر
درد کیے ہم سے　　چھاؤں لکھیں گے ہم
یہ اشک ہمارے ہیں　　اب دھوپ کی تختی پر

مختار صاحب چونکہ سرکاری ملازمت میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اس لیے وہ بچوں کی نفسیات اور ان کے مزاج وطبیعت اور فطرت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے ادب اطفال پر بھی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ادب اطفال کی اہمیت اور اس کی افادیت پر ڈالی ہے راجستھان کے وہ اکلوتے اطفالی شاعر اور نثر نگار ہیں۔ جنھوں نے بچوں کے لیے مختلف انداز سے اخلاقی اور تربیتی کہانیاں اور دلچسپ جاسوسی ناولٹ لکھے۔ وہیں پر انھوں نے بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی، مذہبی تربیتی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے موجودہ دور میں ہورہے نصابی حملے سے

اطفال کی پریشانیوں کو بھی دیکھتے ہوئے نظمیں کہیں ہیں۔ان تمام ہی نظموں کی زبان سادہ اور سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم بھی ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مختار ٹونکی راجستھان کے تناظر میں دنیائے ادب میں اپنا ایک مخصوص مقام رکھتے ہیں۔جن کی ادبی خدمات قابل ستائش ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے نشان رہنمائی ہیں تا کہ مستقبل میں یہی نسلیں ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اور ان کی اس ادبی وراثت کو باقی رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کی پھر پور کوشش کرتی رہیں گی۔

☆ ☆ ☆

تلخیص

مختار ٹونکی دور جدید میں اردو ادب کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ جن کو ادبی اور علمی اعتبار سے ایک مقام حاصل ہے۔ ان کی شخصیت نے مختلف جہات اور افکار عالیہ، ادراک اور جدت طرازی کے ساتھ اردو ادب کو ایک نئی روش سے روشناس کرایا ہے۔

اس تحقیقی مقالے کی اہمیت وافادیت اسی وجہ سے ہے کہ مختار صاحب نے اردو نثر کو ایک اہم مقام عطا کیا ہے۔ وہ نثر کے میدان میں ایک انشائیہ نگار، طنز ومزاح نگار، افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے ایک الگ ہی مقام رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے سر پر اردو ادب میں ایک نئی صنف کی ایجاد کا بھی سہرا ہے۔ جس کو انھوں نے طنشائیہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس صنف میں انشائیہ کا رنگ وآہنگ، تازگی اور طنز کی شوخی کے ساتھ ہی مزاح کی چاشنی بھی شامل ہے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے طنز ومزاح کو بلندی تک پہنچایا ہے۔ اس روش کو کم ہی لوگ اختیار کرتے ہیں اور اس کو دویم درجے کا ادب تصور کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مختار ٹونکی نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے پانچ مجموعے منظر عام پر آکر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

مختار ٹونکی نے شعر وسخن کی دوسری اصناف میں بھی جولانی طبع کا اظہار کیا اور راجستھان میں فراز حامدی اور نذیر فتح پوری کے بعد تیسرے ماہیہ نگار کے طور پر اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بطور ادب اطفال نگار اردو ادب میں ایک الگ ہی مقام بنایا ہے۔ ان کی تمام ہی تخلیقات قاری کو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرتی ہیں، ذہن کو بیدار کرتی ہیں اور غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں، نئے نئے خیالات اور سوچ پر ان کا قلم متواتر چلتا رہتا ہے۔ جس کی تازہ مثال موجودہ دور میں پھیلی ہوئی عالمی وبا (Pandemic) ''کورونا'' ہے۔ جس پر اس عنوان سے ایک تصنیف کا کام چل رہا ہے۔

مختار ٹونکی کی فکر اور عملی خصوصیات کے باعث ہی یہ تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا جا رہا ہے جو کہ مندرجہ ذیل

ابواب پر مشتمل ہے:۔

باب اول :۔ ریاست ٹونک کا تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر

باب دوم :۔ مختؔار ٹونکی کے سوانحی کوائف

باب سوم :۔ مختؔار ٹونکی اور ان کے ادبی کارنامے

باب چہارم:۔ مختؔار ٹونکی بہ حیثیت شاعر

باب پنجم :۔ مختؔار ٹونکی بہ حیثیت ادب اطفال نگار

باب ششم :۔ ماحصل

باب اول :۔ ریاست ٹونک کا تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر

اس باب کی ابتدا میں ریاست ٹونک کے تاریخی پس منظر کا بیان کیا گیا ہے۔ٹونک کے معنی نوک دار پہاڑی کے ہیں۔ یہ ریاست رسیا کی نوک دار پہاڑی کے دامن میں آباد ہونے کی وجہ سے ٹونک کے نام سے موسوم کی گئی ہے۔ دہلی کے راجہ مٹن پال نے اپنے بھائی سے ناراض ہوکر راجپوتانے میں آنے پر یہاں قیام کیا اور اس علاقے کو بسایا اور ''ٹوکرا'' نام دیا۔اس ریاست کو بسانے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے ہی اہم رول ادا کیا ہے۔جن میں تنور، چوہان، سسودیہ اور ہولکر حکمراں قابل ذکر ہیں۔نواب امیر الدولہ کے ہاتھ میں جب اس ریاست کی زمام کار آئی تو انھوں نے اس ریاست میں کچھ روایات کو بھی قائم کیا۔ وہ ایک جانباز سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر سیاست داں اور ادب پرور بھی تھے۔اس کے علاوہ ان کو فن شاعری میں بھی خاص رغبت تھی۔نوابان ٹونک نے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی فروغ میں کسی بھی طرح کی کوئی کمی نہ رکھی جن میں خاص طور پر نواب ابراہیم علی خاں سے لے کر نواب سعادت علی خان تک کا دور اہم رہا۔

باب کے اگلے حصے میں ریاست کی تہذیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ٹونک میں تمام ہی مذہب کے لوگ اپنے اپنے تہوار اور روایات بڑے ہی جوش وخروش اور احترام کے ساتھ مناتے تھے۔ ٹونک کی تہذیب اپنی روایات کے اعتبار سے قومی یکجہتی کی عمدہ مثال ہے۔ چاہے عید ہو یا پھر گنگور تمام لوگ بڑے خوشی اور احترام

کے ساتھ مناتے ہیں۔ٹونک کے مساجد ومنادر، باغات، باوڑیاں، تالاب، کوٹھیاں اور چھتریاں تمام عمارتیں یہاں کی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔اس کے علاوہ یہاں پر مدارس کو بھی خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ جہاں پر حصول تعلیم کے لیے نہ صرف ملک ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک سے بھی طلبا علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔اس کے علاوہ وہاں پر جدید تعلیم کے حصول کے لیے بھی اسکول اور کالج کا قیام بھی کیا گیا۔

باب کے آخری حصے میں ٹونک کے ادبی پس منظر کا بیان کیا گیا ہے۔ادبی اعتبار سے اس ریاست کا قیام بڑا ہی شاندار اور تابناک رہا ہے۔ یہاں پر محفل شعروادب کے ساتھ ساتھ محفل میلا دکو بھی خاصا فروغ ملا ہے۔عید میلا دالنبی کے موقع پر منعقد ہونے والا پروگرام برسہا برس تک چلتا رہا۔جس میں نبی کریم ﷺ کی سیرت اور شان میں بڑے ہی شان دار پروگرام ہوتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دہلی اور لکھنو سے متعدد شعرائے کرام ٹونک میں آئے اور یہیں پر بود و باش اختیار کی کیونکہ یہ ریاست دوسری ریاستوں کے مقابلے ملک کے ان ہنگامی حالات میں قدر محفوظ تھی اور یہ دہلی سے قریب بھی تھی۔جس کو وجہ سے آمد ورفت کا سلسلہ چلا اور اسی کے ساتھ یہاں پر علم وادب کے چراغ روشن ہوئے ۔ یہاں پر آمد ورفت کرنے والے شعراء میں جوشؔ ملیح آبادی، جگرؔ مرادآبادی، ساغرؔ نظامی، غلامؔ ربانی تاباں اور ماہرؔ القادری جیسے معروف شعراء تھے۔جن کی وجہ سے یہاں کی ادبی فضا مہک رہی تھی۔

ریاستی دور کے خاتمے کے بعد جب ملک ایک اکائی میں قائم ہو رہا تھا تو ریاست ٹونک بھی راجستھان بن جانے کے بعد ایک ضلع کی شکل میں نمودار ہوئی۔۱۵/اگست ۱۹۴۹ء کو ریاست پانچ حصوں میں تقسیم کردی گئی جس میں ٹونک اور علی گڑھ کو جے پور ڈیویژن میں رکھا گیا۔ ۷/اکتوبر ۱۹۴۹ء کو جے پور ڈیویژن کے سرکاری فرمان کے بعد ہی دیگر سات اضلاع کے ساتھ ٹونک کو بھی ایک ضلع کے طور پر شامل کرلیا گیا۔

باب دوم :۔ مختارؔ ٹونکی کے سوانحی کوائف

اس باب میں مختارؔ ٹونکی کی شخصیت اور حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس ضمن میں مختارؔ ٹونکی سے

ملاقات کی گئی اوران کی زندگی سے متعلق معلومات حاصل کی گی ہیں۔مختارٹونکی پر''ماہانہ شگوفہ'' جولائی ۲۰۱۴ء میں''مختارٹونکی گوشہ'' جاری کیا گیا تھا۔ یہ گوشہ ان کے تخلیقی سفر، انٹریوز کے ساتھ دیگر معلومات پر منحصر تھا۔ اس باب کی تکمیل کے لئے اس ماہنامے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

موصوف کا پورا نام سید مختار علی ہے اور قلمی نام مختارٹونکی ہے۔اوران کے والد کا نام ممتاز علی اور والدہ کا نام صدیقہ خاتون تھا۔ان کی ولادت ۴/اپریل ۱۹۳۹ء کو ہوئی تھی۔

اس باب میں اولاً مختارٹونکی کے خاندان کا ذکر کیا گیا ہے۔ان کی خاندان میں دینی تعلیم تو تھی مگر دنیاوی تعلیم کا فقدان تھا۔ ان کے والد نواب صاحب کی والدہ مرجینہ بیگم کے ڈرائیور تھے۔موصوف گھر میں سب سے بڑے تھے۔ان کے والد نے ان کو تعلیم کے لیے مدرسے میں داخل کرایا۔

خاندان کے حالات کے بعد ان کی تعلیم، ملازمت، ازدواجی زندگی ، عادات واخلاق کے ساتھ ہی شوق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم ٹونک کے مدرسے فرقانیہ میں حاصل کی جہاں پرانھوں نے قرآن اورعربی کی تعلیم حاصل کی۔اس کے علاوہ انھوں نے اردو، ہندی، انگریزی زبانوں کی بھی تعلیم حاصل کی۔۱۹۶۳ء میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں آ گئے اور دوران ملازمت وہ مکرانہ، جودھ پور، ناگور، اور جیسلمیر رہے اوراپنی تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے قلم کورواں رکھا۔ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز ملازمت میں آنے کے بعد ہوا۔۱۹۷۳ء میں ٹونک کے تحصیل دار صاحب کے بیٹی فاطمہ بیگم سے ان کا نکاح ہوا۔خدا نے ان کو چار بیٹے اور دو بیٹیوں سے نوازہ جن کی تعلیم وتربیت کے فرائض انھوں نے بخوبی انجام دیئے۔ان کے مزاج کی بات کی جائے تو وہ ایک سادہ مزاج، وقت کے پابند اور سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں۔

اس باب کی اگلی فصل میں موصوف کے تخلیقی سفر کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔ان کا تخلیقی سفر طالب علمی کے زمانے ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ان کی پہلی تخلیق ہفتہ وار''آئینہ'' میں''بدحواسی'' کے عنوان سے ۲۳/ جنوری ۱۹۵۶ء کو شائع ہوئی تھی۔اس کے بعد ان کا پہلا افسانہ''ملکہ دولت'' کے نام سے ۱۹۵۷ء میں پیام

مشرق میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں ان کے لکھنے کا سلسلہ متواتر چلتا رہا۔ وہ ٹونک کی شعری فضا سے بھی متأثر تھے اور مشاعروں میں بھی شرکت کیا کرتے تھے لیکن مشق سخن کی جانب توجہ بہت بعد میں کی۔ ناگور میں ملازمت کے دوران ہی انھوں نے شاعری کی ابتدا کی۔ اپنی شاعری پر ٹونک کے مشہور تاریخ گو شاعر حضرت بصر ٹونکی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ان کے تین شعری مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔

''سب رنگ سخن کے'' ان کے اس مجموعے میں سبھی اصناف سخن شامل ہیں۔ دوسرا مجموعہ ''صد رنگ ماہیے'' کے نام سے ہے یہ مجموعہ ماہیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ان کا نعت پر مشتمل ایک مجموعہ ہے۔ جو کہ ''ربنا وسیدنا'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کا خاص میدان طنز و مزاح نگاری ہے۔ اس میں ان کے پانچ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

'اوٹ پٹانگ'، 'لغویات'، 'خرافات'، 'مزخرفات' اور 'ہفوات'' موصوف نے اپنے ان مجموعوں میں طنز و مزاح کے معیاری اور شائستہ ادب کو پروان چڑھایا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو ادب اطفال میں بھی عبور حاصل ہے انھوں نے اس میدان میں بچوں کے لیے جاسوسی ناولٹ، کہانیاں، اور نظمیں لکھی ہیں۔ جو ان کے اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانے کے غرض سے لکھی گئی ہیں۔

باب کے آخری حصے میں ان کی ادبی کارکردگی اور اعزازات اور انعامات کا بیان کیا گیا ہے۔ موصوف ٹونک میں ادبی سوسائٹی کے صدر کے طور پر بھی اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹرینگ اردو اساتذہ ایس، آئی، ای، آر، آئی اودے پور، اسسٹینٹ ٹاسک فار راجستھان لٹریری مشن جے پور اور فاصلاتی تعلیمی کورس بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن اجمیر کے رسوس پرسن کے طور پر بھی رہ چکے ہیں۔ انجمن اساتذہ اردو راجستھان، جن داری لیکھک سنگھ جے پور، محمود شیرانی اکادمی ٹونک کے کارکن کی حیثیت سے بھی آپ نے کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ ساکشرتا سمیتی ٹونک کے جانب سے ''آؤ ہم پڑھیں'' اردو شکشا کرمی ٹرینگ ماڈل اور بزم ادب پروگرام میں بھی شامل رہ چکے ہیں۔

اعزازات میں ان کو راجستھان اردو اکادمی، جیمینی اکادمی، بزم خوش دلان جودھ پور، ساہتیہ کلا

منڈل، غالب سوسائٹی، بہار اردو اکادمی، راشٹریہ سہارا، راجستھان پتریکا کی جانب سے بھی ایوارڈ دیئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ ان کو مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کی جانب سے بھی لائف ٹائم اچیومنیٹ ایوارڈ دیا گیا ہے۔

باب سوم :۔ مختؔار ٹونکی اور ان کے ادبی کارنامے

باب سوم مختؔار ٹونکی کی نثر نگاری پر مشتمل ہے۔جس میں ان کی انشائیہ نگاری،طنز ومزاح نگاری، افسانہ نگاری، خاکہ نگاری کے ساتھ تحقیق وتنقید نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان کی نگارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو نثر میں ان کا مقام ومرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔جس سے ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ ان کی نثر میں عہد جدید کی فکر تقاضے اور جد جہد کو پیش کیا گیا ہے۔مختؔار ٹونکی کی تحریروں میں بیانیہ اسلوب نمایاں ہے۔انھوں نے اپنے مضامین میں سماج اور معاشرے کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو کہ اکثر لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔وہ اپنی ظرافت نگاری کے ذریعہ طنز کے تیر چلاتے ہیں۔اپنی تحریروں میں صاف اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں۔نیز ان کی نثر میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔مختؔار ٹونکی نے کلاسیکی ادب کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔جس سے ان کی علمی قابلیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ان کی تحریر مقفیٰ مسجع ہے۔طنز مزاح کی چاشنی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نثر میں شاعری کررہے ہیں۔ایک اقتباس جس سے ان کی تحریر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

> اقبال نے یہ طرفہ ستم ڈھایا ہے کہ سارے ہندوستان کو مادہ بنادیا ہے۔خیر گزشت آں کہ گزشت۔ خدا بخشے مرزا غالب کو جب ان کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا تو خواجہ الطاف حسین حالی نے بے حال ہوکر زبردست شخصی مرثیہ لکھ کر بصد رنج وغم لکھا اور کہا۔
>
> بلبل ہند مرگیا ہیہات
> جس کی ہر بات میں تھی ایک بات

لوگ تو سروجنی نائیڈو کو بلبل ہند ٹھہراتے ہیں۔ اگر حالی نے غالب کو پس مردن یہ لقب دے کر مذکر ٹھہرا دیا ہے تو جرم کبریٰ تھوڑی کیا ہے۔ غالب تو ماشاءاللہ سرتاپا مذکر ہی تھے۔ اور پھر میر انیس کی سند بھی تو حالی کے سامنے تھی۔ ایک مرثیہ انھوں نے کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے کہ ؎

بلبل چہک رہا تھا ریاض رسول میں

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کی تحریر میں مولانا محمد حسین آزاد کی طرز نگارش کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اس سے ان کی علمیت، قابلیت اور الفاظ کے ذخیرے کا اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے، وہ جہاں چاہتے ہیں جیسا چاہتے ہیں الفاظ کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں فارسی محاورہ، عربی، ہندی اور انگریزی لفظوں کا استعمال بھی جا بجا کرتے ہیں جو کہ ان کی تحریر کی چاشنی اور لطافت کو بڑھا دیتا ہے۔ اس باب میں ان کے طنشائیہ (طنز و مزاح اور انشائیہ) کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ طنشائیہ لفظ خود مختار صاحب کی ایجاد ہے جس کے لیے انھوں نے اپنے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو ملا کر طنشائیہ کا نام دیا ہے ان کے علاوہ ان کی افسانہ نگاری اور تنقید نگاری کے ساتھ تحقیق کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم :۔ مختار ٹونکی بہ حیثیت شاعر

مقالے کے چوتھے باب میں مختار صاحب کی شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے۔ بطور شاعر بھی ان کی ادبی خدمات قابل ذکر ہیں۔ آپ شاعری میں بھی اپنی قابلیت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ آپ نے ٹونک کی دلکش اور شاعرانہ ادبی فضا میں پرورش پائی ہے۔ شاعر جس ماحول میں تربیت پاتا ہے اس کی جھلک اس کے کلام اور تحریر میں شعوری و غیر شعوری طور نظر آ ہی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر ان کے شعر و سخن کا اندازہ بآسانی ہو جاتا ہے۔ جو اپنی جاذبیت اور غنائیت سے قاری کو اپنے طرف متوجہ کر ہی لیتی ہے۔

اس باب میں ان کی غزل، نظم کے علاوہ دیگر اصناف مثلاً رباعی، قطعہ، گیت، ماہیئے ہائیکو، دوہا، سین ریو، سہرہ، سہاگ اور چاربیت وغیرہ کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ سرزمین ٹونک میں چاربیت کو بڑی اہمیت حاصل

رہی ہے ۔ یہ وہ صنف شاعری ہے جس کا رواج دور حاضر میں کم ہو گیا ہے لیکن مختار صاحب کو چہار بیت ،سہرہ اور سہاگ وغیرہ پر مہارت حاصل ہے ۔

موصوف کی شاعری میں ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا بیان ملتا ہے ۔ ان کی غزلوں کا طرہ امتیاز ان کی رنگینیاں اور رعنائیاں ہیں ۔ عربی و فارسی کے نامانوس اور ثقیل الفاظ کا استعمال نہیں کرتے ہیں ۔ ان کی غزلوں میں درد وغم کے ساتھ سوز و گداز ہے کے ساتھ حسن و عشق کی وارداتیں ہیں ۔ ان کے اس جذبہ کی ترجمانی کرتے یہ اشعار :۔

بزم انجم دلہن سی لگتی ہے
یہ تری انجمن سی لگتی ہے
جان لیوا ہے کتنی تنہائی
چاندنی بھی کفن سی لگتی ہے
نگاہ شوق جب سے مرکز حسن نگاراں ہے
مری نظروں میں پھیکا سا جمال ماہ تاباں ہے
بڑا شہ زور جذبہ ہے محبت جس کو کہتے ہیں
یہ آندھی ہے یہ طوفاں ہے یہ برق باد و باراں ہے

انسانی زندگی کے حقائق کا رنگ بھی ان کی شاعری میں خوب نظر آتا ہے ۔ زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میں فرشتہ نہ ہو سکوں گا کبھی
مجھ میں انساں کی خوبیاں رکھ دے
بڑا عجیب سا منظر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک گل مجھے اخگر دکھائی دیتا ہے

رئیسوں اور رذیلوں سے کبھی یاری نہیں کرتا
میں اب نیلام ہرگز اپنی خودداری نہیں کرتا

غزلوں کے ساتھ ان کی نظموں میں بھی بڑی تاثیر ہے ۔ انھوں نے قومی ، وطنی ، مذہبی ، معاشرتی ، رومانی اور جمالیاتی غرض ہر قسم کی نظمیں کہی ہیں ، ان کی نظمیں پابند نظمیں ہیں ۔ جن میں سماجی مسائل عکاسی کی گئی ہے ۔

وہ ایک سیکولر مزاج کے آدمی ہیں اور فرقہ وارانہ مزاج کے خلاف ہیں ۔ اس تحقیقی مقالے میں ان کی ان خصوصیات کا احاطہ کیا گیا ہے ۔ قومی جذبے کا اظہار کرتی ان کی نظم کے یہ بند:

عصر نو عظمتیں ہیں شان تہذیب کہن
طرز یہ جمہوریت کی سیکولر اس کا چلن
ہند کے دستور میں اب نہ فرق ما و من
شعبہ ہائے زندگی میں بڑھ گیا میرا وطن

بڑھتا ہوا یہ قافلہ ہر ایک ہی منزل میں ہے
یہ میرا پیارا وطن دنیا کی آب و گل میں ہے

مختار ٹونکی فراز حامدی اور نذیر فتح پوری کے بعد راجستھان کے تیسرے ماہیئے نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں ۔ انھوں نے راجستھان میں ماہیہ نگاری کے میدان میں اہم رول ادا کیا ہے اور درست اوزان و بحر میں دلکش ماہیئے کہے ہیں ۔ چند ماہیئے درج ذیل ہیں ۔

دل صاف نہیں ملتے — پھولوں کا ذخیرہ ہے
لوگ تو ملتے ہیں — یاد کا آنگن ہے
اشراف نہیں ملتے — خوشبو کا جزیرہ ہے

باب پنجم :۔ مختار ٹونکی بہ حیثیت ادب اطفال نگار

مقالے کا یہ باب مختار صاحب کی ادب اطفال نگاری پر مشتمل ہے ۔مختار ٹونکی کا دائرہ ادب بہت بڑا ہے ۔انھوں نے شاعری ،نثری اور تنقیدی میدان میں بھی فنی کارنامے تو انجام دیے ہی ہیں اسی کے ساتھ ادب اطفال نگاری میں جدت طرازی کا اظہار کیا ہے ۔بچوں کی ذہنی نفسیات اور طبیعت ومزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے نظمیں ،کہانیاں ،ناولٹ بھی لکھے ہیں ۔

اس باب کی ابتدا ادب کی تعریف سے کی گئی ہے کہ ادب صرف زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا ہے بلکہ ادب ہماری روزمرہ کی زندگی کے واقعات اور خیالات کے اظہار کے ساتھ اس کے مسائل کو بھی پیش کرنے کا ذریعہ ہے ۔ادب کی مختلف نوعیت ہوتی ہیں ۔جس میں بڑوں کے ادب کی طرح بچوں کے ادب کی بھی اہمیت ہے ۔ بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں ان کی نشو نما اور پرورش ان کی ذہنی کیفیت ، جذبات ،اور احساسات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کرنا چاہیئے ۔

باب کے اگلے حصے میں اردو میں ادب اطفال کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے ۔اردو ادب میں بچوں کے ادب کی شروعات نصابی تعلیم کے طور پر کی گئی ہے ،۔جن میں معاشرتی اور مذہبی حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیمی کتابیں تیار کی گئیں ہیں ۔جن میں دکن کے شاہ حسن ذوقی کی مثنوی ''ماں باپ نامہ'' کو اولیت حاصل ہے ۔شمالی ہند میں میر تقی میر نے ''بکری اور کتے'' اور ''موہنی بلی'' جیسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں ۔نظیر اکبر آبادی نے قومی اور اخلاقی نظموں سے بچوں کو درس دیا ہے ۔ادب اطفال میں اسماعیل میرٹھی کا نام سنہرے الفاظ میں لکھا جاتا ہے ۔وہ ادب اطفال کے بلند پایہ شاعر مانے جاتے ہیں انھوں نے بچوں کے لیے نصابی کتب تیار کیں ۔بیسویں صدی میں ڈاکٹر ذاکر حسین ،عابد حسین ،اطہر پرویز ،قدسیہ زیدی ،عبدالغفار ،شفیع الدین نیر جیسے حضرات نے ادب اطفال کو فروغ دیا ہے ۔

باب کے اگلے حصے میں مختار ٹونکی کی ادب اطفال نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔انھوں نے اپنی قوت مشاہدہ سے طنز ومزاح نگاری کے علاوہ ادب اطفال میں بھی وسعت پیدا کی ہے ۔بچوں کے لیے شاعری اور نثر میں کہانیاں اور جاسوسی ناولٹ بھی لکھے ہیں اس کے علاوہ قومی ، مذہبی اور دینی موضوعات پر بھی انھوں نے

نظمیں لکھی ہیں جن میں سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تمام نظمیں بچوں کی ذہنیت کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

باب کے نثری حصے میں بچوں کے لیے لکھی گئی سچی کہانیاں اور دیسی لوک کہانیاں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ جو کہ حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔

باب ششم : ماحصل

مقالے کے آخری باب کو ماحصل کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔مختؔار ٹونکی راجستھان میں پیدا ہوئے، ٹونک کے ادبی ماحول میں پرورش پائی۔موصوف کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے ان کے والدین نے ہر ممکن کوشش کی اور ان کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ٹونک کی شعری فضا کا ان پر اثر ہوا جس کے اثرات ان کی نظم ونثر دونوں میں نظر آتے ہیں۔موصوف اپنے ذاتی مشاہدات، تجربات، محسوسات اور فطری میلانات کی آمیزش سے اپنی نثر کو ایک نیا آہنگ دیتے ہیں۔طنز ومزاح نگاری سے سماج میں موجود بے راہ روی اور ناہمواریوں کو اپنی ہلکی پھلکی مزاحیہ آمیزش سے طنزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔مختؔار ٹونکی کا مقصد سماجی برائیوں کی جراحی کرنا نہیں ہے بلکہ معاشرے کے عیوب کا اظہار ہے اور اپنی بصیرت سے تہذیب کے دائرے میں رہ کر قاری کو فرحت وانبساط فراہم کرانا ہے۔ وہ اپنے مضامین میں اپنے گرد وپیش کے ماحول سے مواد اکٹھا کرتے ہیں اور سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے واقعات کا اپنے مضامین اور افسانے میں بیان کرتے ہیں۔

ان کی تصانیف پر روشنی ڈالنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک باوقار اور باصلاحیت اعلیٰ ادبی ذوق کے مالک، صاحب نظر نقاد، محقق اور بہترین مزاح نگار ہیں۔

مقالے کے آخر میں کتابیات اور مختؔار ٹونکی کی نثری وشعری تخلیقات کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

☆☆☆

﴿کتابیات﴾

نمبر شمار	تصنیف کا نام	مصنف	مکتبہ	سن اشاعت
۱:۔	ٹونک ریاست کے حکمراں	صاحبزادہ عبدالمعید خاں	اے، پی، آر، آئی ٹونک	۲۰۱۰ء
۲:۔	اردو میں اصول تحقیق	ڈاکٹر سلطانہ بخش	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو	۲۰۱۲ء
۳:۔	ریاست ٹونک اور اسکے حکمراں کا مختصر تعارف	صاحبزادہ عبدالمعید خاں	اے، پی، آر، آئی، ٹونک	۲۰۱۳ء
۴:۔	تاریخ ٹونک	محمد اعجاز خاں	اے، پی، آر، آئی ٹونک	۱۹۸۳ء
۵:۔	ظرافت دوماہی	عظیم الدین عظیم	دفتر انجمن بنگلور کرناٹک ۰۶۔	۲۰۰۵ء
۶:۔	راجستھان کی ادبی تاریخ	عبدالمعید خاں	اے، پی، آر، آئی ٹونک	۲۰۰۸ء
۷:۔	اردو غزل	یوسف حسین خاں	ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی	۱۹۹۸ء
۸:۔	تذکرہ شعرائے ٹونک	شمیم ٹونکی	اے، ایچ پرنٹرس مرادآباد	۱۹۹۳ء
۹:۔	ادبی جائزے	عزیز اللہ شیرانی	ہماری طاقت پبلیکیشن جے پور	۲۰۱۶ء
۱۰:۔	مولوی سلیم الدین تسلیم حیات وخدمات	ڈاکٹر حسن آرا	سامی مارکیٹ نیا پورہ کوٹہ	۲۰۰۵
۱۱:۔	راجستھان میں شعری گلدستوں کی روایت اور اہمیت	ڈاکٹر نادرہ خاتون	انیس کتاب گھر ٹونک	۲۰۱۰ء
۱۲:۔	ریاست ٹونک اور اردو شاعری	مختار شمیم	نسیم بک ڈپو لاروس روڈ لکھنو	۱۹۷۴ء
۱۳:۔	ریاست ٹونک کا ایک تعارف	اکبر شہابی	دبستان صائب ٹونک	۲۰۱۱ء
۱۴:۔	انشائیہ کی روایت	محمد اسداللہ	ستارہ پریس آگرہ	۱۹۰۱ء

۱۵:۔ ہندوستانی شاعری	ڈاکٹر ام ہانی اشرف	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۵ء
۱۶:۔ جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۳ء
۱۷:۔ تحقیق کا فن	گیان چند جین	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو	۲۰۰۸ء
۱۸:۔ شاعری کی تنقید	ابوالکلام قاسمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۱ء
۱۹:۔ تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۷ء
۲۰:۔ اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۳ء
۲۱:۔ راجستھان میں اردو طنز و مزاح	پریم شنکر سری واستو	راجستھان اردو اکادمی جیپور	۱۹۹۱ء
۲۲:۔ تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۷ء
۲۳:۔ تنقید اور اصول تنقید	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ادارہ ادب و تنقید لاہور	۱۹۸۴ء
۲۴:۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء	فرمان فتح پوری	ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی	۲۰۱۳ء
۲۵ :۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء	فرمان فتح پوری	ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی	۲۰۱۳ء
۲۶:۔ اردو میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر صابرہ سعید	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۹ء
۲۷:۔ اردو زبان کی تاریخ	مرزا خلیل بیگ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۱۰ء
۲۸:۔ اردو زبان کی تشکیل	مرزا خلیل بیگ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۱۲ء
۲۹ :۔اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمان اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۱۲ء
۳۰:۔ فن تنقید اور اردو تنقید نگاری	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۱ء
۳۱:۔ اصناف اردو ادب	ڈاکٹر قمر رئیس، خلیق انجم	سرسید بک ڈپو علی گڑھ	۱۹۹۷ء
۳۲:۔ یہ ہیں انشائیے	محمد اسداللہ	مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ ممبئی	۲۰۱۷ء
۳۳:۔مقدمہ تاریخ زبان اردو	مسعود حسین خان	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۲ء
۳۴:۔اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۸ء

۳۵:۔ آج کا اردو ادب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۳ء

۳۶:۔ اردو شاعری کا مزاج وزیر آغا سیمانت پرکاشن نئی دہلی ۱۹۷۴ء

۳۷:۔اردو ادب میں طنز و مزاح وزیر آغا مکتبہ جامعہ لیمیٹید نئی دہلی ۱۹۹۹ء

۳۸:۔ انشائیے کے خدوخال وزیر آغا سیمانت پرکاشن نئی دہلی ۲۰۱۲ء

۳۹:۔ نیا افسانہ وقار عظیم ---------- -----

۴۰:۔ اردو میں افسانہ نگاری کی تنقید ڈاکٹر پروین اظہر ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۰ء

۴۱:۔ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ سنبل نگار ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۲۰۰۱ء

۴۲:۔ اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ سنبل نگار ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۳ء

۴۳:۔ نیا اردو افسانہ گوپی چند نارنگ دہلی اردو اکادمی دہلی ۲۰۱۰ء

۴۴ :۔ اردو افسانہ حقیقت سے علامت تک سلیم اختر دہلی اردو اکادمی دہلی ۱۹۸۹ء

۴۵ :۔غزل اور مطالعہ غزل ڈاکٹر عبادت بریلوی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۰۴ء

۴۶:۔ اردو میں خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ عائشہ طلعت شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی ۲۰۱۲ء

۴۷:۔اردو شاعری میں طنز و مزاح مظہر احمد شبانہ پبلی کیشنز دہلی ۲۰۰۱ء

۴۸:۔ اردو نثر کا ارتقاء عابدہ بیگم ثمر آفسیٹ پریس دہلی ۱۹۸۸ء

۴۹:۔طنزیات و مضحکات رشید احمد صدیقی مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ نئی دہلی ۲۰۱۱ء

۵۰ :۔رہنمائے ضلع ٹونک دھرمیندر بھٹناگر، بی کے سنگھل اے، پی، آر، آئی ٹونک ۲۰۱۶ء

۵۱ :۔تاریخ ریاست ٹونک ہنومان سنگھل اے، ون آفسیٹ پریس دہلی ۱۹۹۶ء

۵۲:۔ راجستھان میں اردو نثر کی ڈاکٹر قمر جہاں بیگم ایم، آر آفسیٹ پریس دہلی ----

ایک صدی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ء

۵۳:۔ ادبیات راجستھان عزیز اللہ شیرانی گلوبل اردو کمپیوٹرس جے پور ۲۰۱۲ء

۵۴ :۔ادراک ادب	عزیز اللہ شیرانی، مسعود اختر	دہلی	۱۹۹۴ء
۵۵:۔ اردو ادب میں طنز و مزاح	غلام احمد فرقت کاکوری	سرفراز پریس لکھنو	------
۵۶ :۔ مختار ٹونکی شخصیت اور فن	ملک فیاض احمد	شعبہ اردو راجستھان یونیورسٹی جیپور	۲۰۰۶ء
۵۷ :۔افسانے راجستھان کے	عارفہ سلطانہ	راجستھان اردو اکادمی جے پور	۱۹۹۶ء
۵۸ :۔مختصر افسانے کا ارتقاء پریم چند تا حال	جمال آرا نظامی	نورسی پبلیکیشنز کراچی	----
۵۹:۔ اردو کے منتخب گیت	ڈاکٹر قیصر جہاں	اتر پردیش اردو اکادمی	۱۹۸۳ء
۶۰ :۔اردو ادب کے ہمہ جہت فن کار فراز حامدی	رفیق شاہین	ادبی دنیا پبلیکشن جے پور	۲۰۰۶ء
۶۱:۔ شوکت بیانی	صاحبزادہ شوکت علی خاں	انیس کتاب گھر ٹونک	۲۰۱۰ء
۶۲:۔ ادب کا مطالعہ	اطہر پرویز	اردو گھر علی گڑھ	۱۹۸۶ء
۶۳:۔ مغربی بنگال اور بچوں کا ادب	عاصم شہنواز شبلی	مغربی بنگال اردو اکادمی کولکاتہ	----
۶۴:۔ اقبال اور بچوں کا ادب	زیب النساء بیگم	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۲۰۰۰ء
۶۵:۔ اردو میں بچوں کا ادب	ڈاکٹر خوشحال زیدی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۹ء
۶۶ :۔ غالب اور راجستھان	شاہد احمد جمالی	راجپوتانہ اردو ریسرچ اکادمی جیپور	---
۶۷:۔ جدید اردو شاعری اور خلیل الرحمان اعظمی	مظہر احمد	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۹ء
۶۸:۔ نئ شعری روایت	شمیم حنفی	مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ نئ دہلی	۱۹۷۸ء
۶۹ :۔کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید	طارق سعید	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	-----
۷۰:۔ اردو کے منتخب خاکے	یوسف ناظم	ثمر آفسیٹ پریس نئ دہلی	۲۰۰۷ء

۷۱:۔ مسدس آئینہ ٹونک صادق بہار ٹونکی انیس کتاب گھر ٹونک ۲۰۱۰ء

۷۲:۔اردو میں طنز و مزاح کی روایت ڈاکٹر خالد محمد اردو اکادمی دہلی ۲۰۰۵ء

۷۳ :۔ اردو افسانہ روایت اور مسائل گوپی چند نارنگ ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی ۔۔۔۔۔

۷۴:۔ شاعر ہند رگھوپتی سہائے

فراق گورکھپوری علی صدیقی، فاروق ارگلی پرنٹ آرٹس نئی دہلی ۱۹۹۶ء

۷۵:۔آزادی کے بعد اردو نثر

میں طنز و مزاح نامی انصاری معیار پبلیکیشنز دہلی ۱۹۹۷ء

☆ ☆ ☆

﴿مختار ٹونکی کی تصانیف﴾

نمبر شمار	نام کتب	موضوع	سن اشاعت
۱:۔	اوٹ پٹانگ	انشائیے	۱۹۹۴ء
۲ :۔	منظور الحسن برکاتی	مونوگراف	۱۹۹۴ء
۳:۔	لغویات	انشائیے	۲۰۰۱
۴:۔	عبدالرحیم خانخاناں	سوانح	۲۰۰۱ء
۵:۔	فکر پارہ پارہ	ادبی مضامین	۲۰۱۰ء
۶:۔	فراز حامدی کی اردو دہانگاری	تالیف	۲۰۱۲ء
۷ :۔	مطالعہ اختر شیرانی	تلاش و تجزیہ	۲۰۱۳ء
۸:۔	سب رنگ سخن کے	شاعری	۲۰۱۳ء
۹:۔	پراسرار فقیر	طفلی ناولٹ	۲۰۱۳ء
۱۰:۔	ڈاکو نیلم	طفلی ناولٹ	۲۰۱۳ء
۱۱:۔	عیار عورت	طفلی ناولٹ	۲۰۱۳ء
۱۲:۔	خونی غبارے	طفلی ناولٹ	۲۰۱۳ء
۱۳:۔	صد رنگ ماہیے	شاعری	۲۰۱۳ء
۱۴:۔	دیسی لوک کہانیاں	کہانی	۲۰۱۵ء
۱۵:۔	یہ دنیا بچوں کی	طفلی نظمیں	۲۰۱۵ء
۱۶:۔	خرافات	انشائیے	۲۰۱۵ء

۱۷:۔	سچی کہانیاں	کہانی	۲۰۱۶ء
۱۸:۔	یادگار بصرٹونکی	شاعری	۲۰۱۷ء
۱۹:۔	مزخرافات	انشائیے	۲۰۱۷ء
۲۰:۔	ہفوات	انشائیے	۲۰۲۰ء
۲۱:۔	ربناوسیدنا	نعتیہ مجموعہ کلام	۲۰۲۰ء

☆ ☆ ☆

﴿مختار ٹونکی کے شائع شدہ افسانے﴾

نمبر شمار	عنوان	رسالہ	سال اشاعت
۱:۔	ملکہ دولت	پیام تعلیم ہفتہ وار	۲/اپریل ۱۹۵۷ء
۲:۔	ہلال عید کے بعد	پیام مشرق ہفتہ وار	۲۱/اپریل ۱۹۵۸ء
۳:۔	آزمائش	ماہنامہ خاتون مشرق	جنوری ۱۹۶۰ء
۴:۔	تلخیاں ہی تلخیاں	ماہنامہ خاتون مشرق	جون ۱۹۶۰ء
۵:۔	شومئی قسمت	ایضاً	ستمبر ۱۹۶۰ء
۶:۔	انوکھا چور	ماہنامہ خاتون مشرق	دسمبر ۱۹۶۰ء
۷:۔	من پھولی کا راز	ماہنامہ خاتون مشرق	اکتوبر ۱۹۶۱ء
۸:۔	جب کھیت سو گئے	ہفتہ وار ایشیاء	۳/اپریل ۱۹۶۲ء
۹:۔	محبت یوں ہی ہوتی ہے	ماہنامہ خاتون مشرق	جون ۱۹۶۲ء
۱۰:۔	کفارہ	ہفتہ وار ایشیاء	۲۵/جنوری ۱۹۶۳ء
۱۱:۔	مامتا اور مکان	ماہنامہ خاتون مشرق	مئی ۱۹۶۴ء
۱۲:۔	کتنی بلندی کتنی پستی	ایضا	اپریل ۱۹۶۵ء
۱۳:۔	اتفاقات ہیں زمانے میں	ایضا	جون ۱۹۶۵ء
۱۴:۔	بات ایک رات کی	ہفتہ وار ایشیاء	۴/ستمبر ۱۹۶۶ء
۱۵:۔	سچا کہانی کار	دھرم چھیتر کرو چھیتر (کتاب)	ستمبر ۱۹۸۲ء
۱۶:۔	راستے اپنے اپنے	کتاب	ستمبر ۱۹۸۵ء

۱۷:۔	ٹوٹتے دائرے	بیچ کا آدمی (کتاب)	ستمبر ۱۹۸۷ء
۱۸:۔	کاش میں لڑکا ہوتی	ماہنامہ خاتون مشرق	نومبر ۱۹۹۰ء
۱۹:۔	جواز	پندرہ روزہ ندیم	جولائی ۱۹۹۰ء
۲۰:۔	پرتی پھل	راتوں جگی کتھائیں (کتاب)	ستمبر ۱۹۹۲ء
۲۱:۔	تتلی کا ساہس	سنو کہانی (کتاب)	ستمبر ۱۹۹۳ء
۲۲:۔	بر ہدف	سہ ماہی جمنا تٹ	اپریل تا جون ۱۹۹۴ء
۲۳:۔	جوگ سنجوگ	مہکتے اکشروں کا آکاش	ستمبر ۱۹۹۵ء
۲۴:۔	جواز	ہفتہ وار راشٹریہ سہارا	۲۴ر دسمبر ۱۹۹۵ء
۲۵:۔	سانکل لگا دو	سہ ماہی جمنا تٹ	اپریل تا جون ۱۹۹۶ء

☆ ☆ ☆

﴿مختار ٹونکی کے تنقیدی مضامین﴾

نمبر شمار	عنوان	رسالہ	سن اشاعت
۱۔	اردو شاعری اور قومی یکجہتی	ماہنامہ سریتا	۱۹۶۳ء
۲:۔	اختر شیرانی اور ان کا نظریہ محبت	نیرنگ دہلی	۱۹۶۳ء
۳:۔	اختر شیرانی کی قومی شاعری	ماہنامہ سریتا	۱۹۶۶ء
۴:۔	جوہر ٹونکی یادوں کی چھاؤں میں	سہ ماہی نخلستان	۱۹۷۷ء
۵:۔	فراق آئینہ رباعیات میں	ماہنامہ پاسباں	۱۹۸۳ء
۶:۔	بیدی کے نسوانی کردار	پرواز ادب	۱۹۹۰ء
۷:۔	اردو تحقیق پر ایک تنقیدی نظر	سہ ماہی نخلستان	۱۹۹۲ء
۸:۔	اردو کی انقلابی شاعری	ماہنامہ پاسباں	۱۹۹۳ء
۹:۔	کامل الفنون شاعر صائب	کتاب نما	۱۹۹۴ء
۱۰:۔	دوہے کی عروض پہچان	ایوان اردو	۱۹۹۶ء
۱۱:۔	اختر شیرانی کی ماہیہ نگاری	قرطاس	۲۰۰۱ء
۱۲:۔	دکن کا ایک دوہا نگار شاعر	قرطاس	۲۰۰۱ء
۱۳:۔	دوہے کا مزاج داں شاعر فراز	لاریب	۲۰۰۱ء
۱۴:۔	پنجابی اردو ماہیہ کے امتیازات	رہنمائے تعلیم	۲۰۰۱ء
۱۵:۔	تاریخ گوئی کے کرشمے	ایوان اردو	۲۰۰۲ء
۱۶:۔	شبلی بہ حیثیت مؤرخ	رہنمائے تعلیم	۲۰۰۲ء

۱۷:۔ اردو کے چند اہم ماہیہ نگار	ترکش	۲۰۰۳ء
۱۸:۔ آنند لہر کی افسانہ نگاری	رہنمائے تعلیم	۲۰۰۳ء
۱۹:۔ اردو شاعری میں سہرے کا رواج	کہسار جرنل	۲۰۰۳ء
۲۰:۔ نسخہ محمدیہ کے مرتب	کتاب نما	۲۰۰۴ء
۲۱:۔ علامہ اقبال اور انور شیخ	قرطاس	۲۰۰۴ء
۲۲:۔ اختر شیرانی کے نثری کارنامے	ایوان اردو	۲۰۰۴ء
۲۳:۔ مومن اور ریاست ٹونک	ایوان اردو	۲۰۰۴ء
۲۴:۔ مضطر خیر آبادی	ایوان اردو	۲۰۰۴ء
۲۵:۔ راجستھان کے ہندو نعت گو شعراء	الحسنات	۲۰۰۴ء
۲۶:۔ مبادیات فن تاریخ گوئی	آندھرا پردیش	۲۰۰۴ء
۲۷:۔ اولیات اختر شیرانی	ایوان اردو	۲۰۰۴ء
۲۸:۔ عظیم شعراء کا عظیم الشان مشاعرہ	رہنمائے تعلیم	۲۰۰۵ء
۲۹:۔ عالمی مزاح نگار۔ مشتاق احمد یوسفی	ظرافت	۲۰۰۵ء
۳۰:۔ دو صدیوں کا شاعر اسحٰق ملک	فنون	۲۰۰۶ء
۳۱:۔ فراز حامدی دربار رسالت میں	رہنمائے تعلیم	۲۰۰۶ء
۳۲:۔ اقرار نامہ دل بے قرار کا	صدائے اردو	۲۰۰۶ء
۳۳:۔ ام الکتاب کے منظوم تراجم	الحسنات	۲۰۰۶ء
۳۴:۔ بول و براز کا شاعر۔ چرکین	صدائے اردو	۲۰۰۷ء
۳۵:۔ شاداب ذکی بارگاہ رب العزت میں	راشٹریہ سہارا	۲۰۰۷ء
۳۶:۔ کسوف اختر	ایوان اردو	۲۰۰۷ء

﴿مختار ٹونکی کے تحقیقی مضامین﴾

نمبر شمار	عنوان	رسالہ	سال اشاعت
۱:۔	سرموگزٹ	ہفتہ وار ہماری زبان	۱۹۶۳ء
۲:۔	غالب اور فن تاریخ گوئی	ماہنامہ نیا دور	۱۹۶۳ء
۳:۔	میر کے نثری کارنامے	ماہنامہ نیا دور	۱۹۶۴ء
۴:۔	اختر شیرانی کا رومان	ہفتہ وار ہماری زبان	۱۹۶۶ء
۵:۔	راجہ بھوانی سنگھ کی اردو خدمات	ماہنامہ شاعر	۱۹۷۰ء
۶:۔	منشی بساون لال شاداں	ہفتہ وار ہماری زبان	۱۹۷۱ء
۷:۔	ساغر شیرانی ایک غیر معروف شاعر	سہ ماہی نخلستان	۱۹۸۷ء
۸:۔	اردو نعت گوئی	ماہنامہ معارف	۱۹۹۰ء
۹:۔	اردو میں گیت کی روایت	راشٹریہ سہارا	۱۹۹۳
۱۰:۔	عبدالحئ رعنا	پرواز ادب	۱۹۹۳ء
۱۱:۔	مولانا آزاد کے متنازعہ سوانحی پہلو	ماہنامہ ابر	۱۹۹۶ء
۱۲:۔	راجستھانی زبان میں دوہے کی روایت	نیا دور	۱۹۹۷
۱۳:۔	ٹونک میں نعت گوئی کا تدریجی ارتقاء	قرطاس	۱۹۹۸ء
۱۴:۔	اولاد واحفا خواجہ غریب نواز	ماہنامہ شفق	۱۹۹۸ء
۱۵:۔	نجم الدولہ اور نجوم	ماہنامہ ابر	۱۹۹۸ء
۱۶:۔	امیر خسرو	ماہنامہ قرطاس	۱۹۹۹ء

۱۷:۔ مومن اور فن تاریخ گوئی	ایوان اردو	۱۹۹۹ء
۱۸:۔ راجستھان میں طنز و مزاحیہ ادب	سہ ماہی نخلستان	۱۹۹۹ء
۱۹:۔ مومن اور نجوم	ایوان اردو	۲۰۰۰ء
۲۰:۔ اختر شیرانی کی جنت ارضی	ایوان ادب	۲۰۰۰ء
۲۱:۔ چار بیت کی پیدائش	کوہسار جرنل	۲۰۰۲ء

☆ ☆ ☆

UGC CARE LISTED JOURNAL
ISSN-2321-1601
Website : www.sabaqeurdu.com

58

Louise Glück

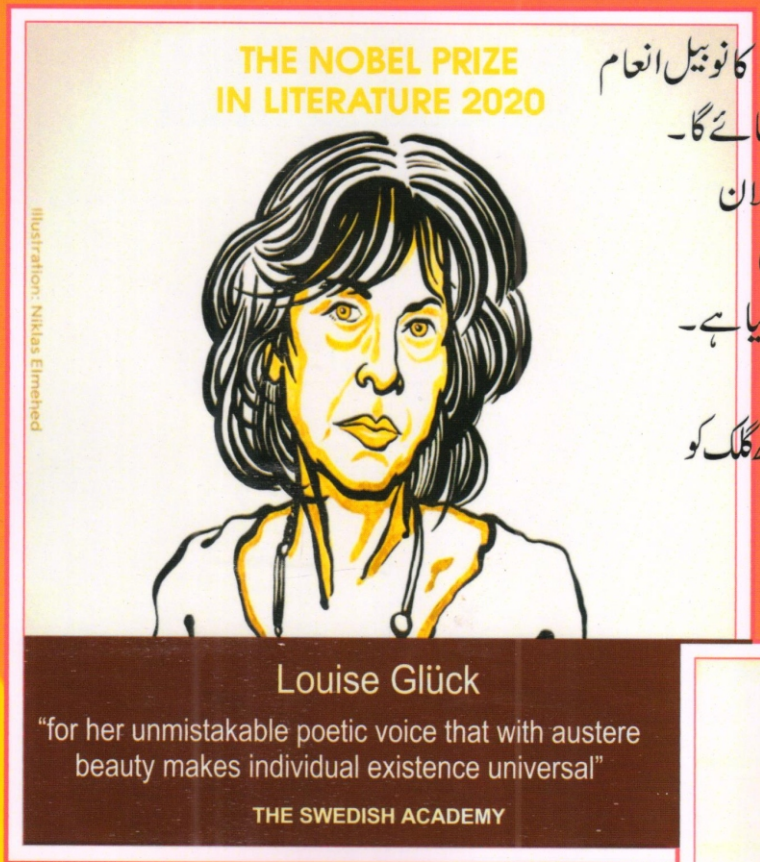

"for her unmistakable poetic voice that with austere beauty makes individual existence universal"

THE SWEDISH ACADEMY

اسٹاک ہوم: 'ادب' کے لئے **2020** کا نوبیل انعام امریکی خاتون شاعرہ لوئس گلک کو دیا جائے گا۔ دنیا کے اس سب سے معتبر ایوارڈ کا اعلان ادیبوں کو سرفراز کرنے والی سویڈن کی سویڈش اکیڈمی آف نوبیل پرائز نے کیا ہے۔ کمیٹی کی جانب سے جاری بیان کے مطابق **77** سالہ لوئس ایلزبتھ گلک کو ان کی بے باک شاعری کے باعث ۲۰۲۰ کا نوبیل انعام دیا جارہا ہے۔

₹ 100/-

مختار ٹونکی ہمہ جہت شخصیت : ایک جائزہ

سلطانہ فاطمی انصاری

راجستھان میں مختلف ریاستوں کا قیام رہا ہے۔ ان ریاستوں میں ریاست ٹونک بھی ایک عظیم الشان ریاست رہی ہے۔ جو اپنی بہت سی خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے ایک ممتاز تاریخی اور ادبی اہمیت کی حامل ہے۔ ٹونک عہد قدیم سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ سرزمین ٹونک میں ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے ٹونک میں اردو ادب کو عروج بخشا۔ ان عظیم شخصیتوں میں حافظ محمد شیرانی، بسمل سعیدی، مخمور سعیدی، مشتاق احمد یوسفی، حامد رشید خاں، سید منظور الحسن برکاتی، جام، کیف، صولت، صائب، فاخر، دل، جوہر، بزمی، ساحل وغیرہ نے دنیائے اردو میں ٹونک کا نام روشن کیا۔ انہیں میں دور حاضر کے جلیل القدر ادیب اور قلم کار مختار ٹونکی ہیں۔ جو گذشتہ کئی سالوں سے اردو ادب میں تحقیقی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مختار ٹونکی کا اصلی نام سید مختار علی ہے اور قلمی نام مختار ٹونکی ہے۔ ۴؍اپریل ۱۹۳۹ء میں راجستھان کے ٹونک ضلع کے کالی پلٹن محلے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک کے مدرسہ شاخ فرقانیہ میں حاصل کی۔ حافظہ معظم شاہ سے قرآن شریف اور عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ عربی وفارسی کے علاوہ اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۶۳ء میں ہی گورنمنٹ سروس میں آگئے۔ دورانِ ملازمت کئی مقامات پر اپنی تعلیمی اور تدریسی خدمات انجام دیئے۔ ساتھ ہی اردو شعروادب میں اپنے قلم کو رواں دواں رکھا۔

مختار ٹونکی ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور غیر معمولی ذہانت سے ایک عرصے سے اردو ادب میں اپنے قلم کو رواں رکھا ہے۔ کم عمر سے ہی نثر نگاری کے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے، وہ دنیائے اردو میں خاص طور پر طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ جس طرح مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مزاحیہ مضامین سے اردو ادب میں عالمی سطح پر مقام حاصل کیا ہے عام اور بقائے دوام کے دربار میں اپنی جگہ بنائی اسی طرح مختار ٹونکی نے اپنی طنز ومزاح نگاری سے شہرت حاصل کی۔ انہوں نے سماج کے مختلف موضوعات پر اپنے طنز ومزاح کے تیر چلائے ہیں۔ طنز ومزاح نگاری سے اپنی تحریروں میں سماجی ومعاشی موضوعات کو پیش کر زندگی کے مختلف مسائل کو بیان کیا ہے۔ طنز ومزاح نگاری کے علاوہ نثر کی دیگر اصناف مثلاً افسانہ، انشائیہ اور خاکہ نگاری میں بھی مختار ٹونکی نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنی تحریروں میں عہد جدید کی فکری تقاضوں وجد وجہد کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی تجربات، واقعات اور مشاہدات کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اپنی تحریروں میں سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں بیانیہ اسلوب نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے مضامین میں سماج میں پھیلی برائیوں، بے راہ روی اور کج روی پر اپنی ظرافت نگاری کے ذریعہ طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ ان کے مزاحیہ فن کو ان کے مجموعہ ''اوٹ پٹانگ'' اور ''لغویات'' میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ خصوصاً مختار ٹونکی نے اپنے مضامین کو طنشائے نام دیا ہے یعنی طنزیہ اور انشائیہ۔ ان مضامین میں انشائیوں کی سادگی، رنگینی، شوخی وظرافت کے ساتھ طنز کی آمیزیش بھی ہے۔

بقول مسعود اختر:

''جناب مختار ٹونکی کی کسی ناقد کے لئے شاعر تنقید نگار اور مزاح نگار کی سہ شخصیات میں سے خوب تر کی تلاش بڑا مشکل کام ہے۔ وہ کم گو ہیں مگر بات میں گہرائی رکھتے ہیں۔ وہ انقلابی نہیں لیکن کچھ سنہرے ڈھنگ دار خواب ضرور پالتے ہیں۔ وہ گھنے اور سایہ دار درختوں کے نیچے راحت کوشی کے ساتھ بے آب وگیاہ صحراؤں کی خاک چھاننا بھی صحت کے لئے مفید مانتے ہیں۔ وہ کثافت کو لطافت اور لطیف تر میں تبدیل کرنے کا جگر اور ہنر دونوں رکھتے اور جانتے ہیں۔

(ماخوذ ''ادارا ک ادب'' ۱۹۹۴)

مختار ٹونکی نے ٹونک کے دلکش شاعرانہ اور برادبی فضا کے ماحول میں پرورش پائی وہ ایک ممتاز اور منفرد نثر نگار کے ساتھ ایک قادالکلام اور صاحب نظر ادیب وشاعر ہیں۔ شاعری میں خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ مختار ٹونکی کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر ان کے شعروسخن کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کی جاذبیت اور غنائیت قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ انہیں زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے وہ بے جا ترکیب اور مانوس الفاظ کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے ابتدا میں ٹونک کی شعروسخن کی محفلوں میں اپنی غزلوں کو پیش کیا اور مختلف نشستوں اور مشاعروں میں ٹونک کی نمائندگی کی۔

مختار ٹونکی کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ان کی رنگینی ورعنائیاں ہیں۔ وہ عربی فارسی کے نامانوس وثقیل الفاظ کا استعمال نہیں کرتے بلکہ آسان وعام فہم الفاظ میں اپنے شعر وضع کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی مترنم بحروں میں ایسی غنائیت اور جاذبیت ہے کہ قاری انہیں پڑھ کر متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

چند اشعار ملاحظہ ہو:

تحریر کی ہے۔

اس دور کے افسانوں کا ہم نے دستور نرالا دیکھا
غیروں سے محبت ہوتی ہے اپنوں کو ستایا جاتا ہے

رنج و غم جتنے ہیں ان کو کالا پانی بھیج دے
اے خدا تو میرے گھر میں شادمانی بھیج دے

کسی دھوم سے اشکوں کی یہ بارات چلی ہے
آنکھوں سے نکل کر مرے دامن میں رکی ہے

کامیاب غزلوں کے ساتھ انہوں نے **پرتاثر انداز** میں نظمیں بھی کہی ہیں۔ انہوں نے قومی، وطنی، مذہبی، معاشرتی، رومانی و جمالیاتی ہر قسم کی نظمیں کہیں ہیں۔ ان کی سبھی نظمیں **پابند** نظمیں ہیں جن میں سماجی مسائل کی عکاسی ہے تو کہیں **زندگی** کی حقیقتوں کی **ترجمانی** کی ہے جن میں طنز کا لہجہ بھی ہے تو کہیں **پاکیزہ جذبہ** ہے۔

نظم ''محبت'' کا **ایک** بند:

خدا کا **ایک** عطیہ ہے **خدا** کی **ایک نعمت** ہے۔-------------------
گراں مایہ یہ تحفہ ہے محبت **ایک دولت** ہے
محبت نور ریز داں ہے محبت ظلِ سبحانی
محبت جام عرفاں ہے محبت کیف ایمانی
محبت آب حیواں ہے محبت ابرِ یسانی

مختار ٹونکی راجستھان کے تیسرے ماہیے نگار تسلیم کئے گئے ہیں۔ انہوں نے **راجستھان** میں ماہیۓ نگاری کی تخلیق شروع کی اور **درست** وزن و بحر کے ساتھ آسان سادہ **زبان** میں ماہیے کہے ہیں۔ انہوں نے ہر موضوع **پر** دلکش اور دل آویز ماہیے لکھے ہیں۔

چند ماہیے **ملاحظہ** ہو:

واللہ نہیں دیکھا
اک بھول چنبلی کا
خود سے **بڑا** کوئی

نقش لکھے مجھ کو
کمراہ نہیں دیکھا
اس شوخ ہتھیلی کا

مختار ٹونکی نے ادب اطفال **پر** بھی اپنے قلم کے جوہر دیکھائے ہیں۔ بچوں کے ادب کے متعلق مختلف موضوعات میں نظموں کے ساتھ تصانیف **بھی تحریر** کی ہیں۔ انہوں نے بچوں کے اخلاق و ذہنی کیفیات کے مطابق کئی کہانیاں اور **ناولٹ تحریر** کئے ہیں۔ ان کے کچھ دلچسپ جاسوسی **ناولٹ** ''عیار عورت''، ''خونی غبارے''، ''ڈاکو نیلم''، ''**پر**اسرار فقیر''۔

مختار ٹونکی نے **نثر** نگاری میں اپنے جوہر دیکھائے ہیں وہی شاعری میں غزل و **نظم** کے علاوہ **دیگر** اصناف مثلاً رباعی، قطع، غزلیات، چار بیت، گیت، دوہے، ماہیۓ، ہائی کو، سین ریو وغیر میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ''**سب رنگ** سخن کے'' ان کی شاعری کا شاہکار ہے۔ جن میں انہوں نے سبھی اصناف

مختار ٹونکی کئی انجمنوں اور اداروں سے وابستہ رہے ہیں۔ **راجستھان** کی انجمن ''**ٹونک** ادبی سوسائٹی'' کی **بنیاد** رکھی جس کے وہ صدر بھی ہے۔ اور ان کو کئی اعزازات اور **انعامات** سے بھی **نوازا گیا** ہے۔ ابھی حال ہی میں انہیں مولا**نا** ابوالکلام آزاد عربی، فارسی **ریسرچ** انسٹی ٹیوٹ **ٹونک** کے **جانب** سے لائف **ٹائم** اچیومینٹ ایوارڈ **دیا گیا**۔

مختار ٹونکی کی ادبی **خدمات گذشتہ** کئی سالوں **پر** محیط ہیں وہ **ایک** ہمہ **جہت** شخصیت کے مالک ہیں۔ اردو ادب کی مشہور و معروف ہستیوں میں انکا شمار **ہوتا** ہے۔ ان کا قلم آج بھی اردو ادب میں اپنے اعجاز دکھا رہا ہے۔

☆☆☆

ISSN : 2582-1229

بین الاقوامی پیر ریویو، ریفریڈ جرنل

تاریخِ ادبِ اردو

(سہ ماہی)

جلد۔۳ شمارہ۔۱

سرپرستِ اعلیٰ: ارتضیٰ کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

مختار ٹونکی: بحیثیت طنز و مزاح نگار

ریسرچ اسکالر:
سلطانہ فاطمہ انصاری،
کوٹہ یونیورسٹی،
کوٹہ، راجستھان

نگراں:
ڈاکٹر نادرہ خاتون
لیکچرر اردو، گرمنٹ آرٹس گرلس کالج
کوٹہ، راجستھان

ملخص

اردو ادب میں ابتداء ہی سے طنز مزاح کے نقوش ملتے ہیں۔اس کے ابتدائی نقوش ہم کو داستانوں، اودھ پنچ اخبار اور غالب کے خطوط میں ملتے ہیں۔ بعد ازاں طنز و مزاح نگاری کا وسعت عطا کرنے میں احمد شاہ پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی فکر تونسوی، کنیہا لال لپور، کرشن چند، مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

موجودہ دور میں طنز و مزاح کی اس روایت کے امین بن کر مختار ٹونکی دنیائے ادب میں اس کی بقا اور تسلسل کے لیے کوشاں ہیں جن کا تعلق بھی ٹونک ہی سے ہے۔اس صنف میں انھوں نے اعلیٰ ترین اور بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔

مختار ٹونکی کی پہچان ایک طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے ہے۔جس طرح ان سے قبل مشتاق

احمد یوسفی نے اپنے مزاحیہ مضامین کے ذریعہ دنیائے ادب میں عالمی سطح پر ایک مقام حاصل کیا ہے اور قبولیت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ بنائی ہے۔اسی طرح سے مختار ٹونکی نے بھی اپنے صلاحیت کے ذریعہ طنز ومزاح نگاری کے میدان میں اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے۔انھوں نے سماج کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور طنز ومزاح کے تیر چلائے ہیں۔انھوں نے عہد جدید کے فکری تقاضوں اور جد جہد کو اپنے ذاتی تجربات،مشاہدات اور احساسات کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ان کی تحریروں میں کلاسیکی رنگ بکھرا پڑا ہے۔اسی لئے وہ اس کے اظہار کے لئے بیانیہ اسلوب کے ساتھ سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں۔وہ منتخب مواد اور موضوع لے کر اس کے واقعات کا بیان بڑے ہی دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔

انسانی زندگی میں خوشی اور غم دونوں پہلو نمایاں طور پر شامل ہوتے ہیں۔مگر انسان غموں پر خوشی کا ترجیح دیتا ہے۔کیونکہ غم واضطراب کی کیفیت انسان کے اندر الجھن اور نا آسودگی پیدا کرتی ہے وہیں مسرت بھرے لمحے اور ہلکی سی مسکراہٹ سے انسان غم بھول جاتا ہے۔اسی لیے انسان کی زندگی میں مسرت اور خوشی کی بڑی اہمیت ہے۔

مزاح ایک فطری احساس ہے جو کہ مسرت اور خوشی کے احساسات پر منحصر ہوتا ہے ۔وہیں شدید طنز کی کیفیت بھی انسانی مزاج کا احاطہ کرتی ہے مگر ادب میں اگر خالص طنز ہو تو وہ بوجھل ہو جاتا ہے اور خالص مزاح بھی انسان کو اکتا دیتا ہے۔اگر ادب میں طنز کے ساتھ ساتھ مزاح کو بھی شامل کر دیا جائے تو اس کے قاری میں لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر غور و

فکر کرنے کے بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

طنز و مزاح کی تاریخی حیثیت پر اگر غور کیا جائے تو اردو ادب میں ابتداء ہی سے طنز مزاح کے نقوش ملتے ہیں۔ اس کے ابتدائی نقوش ہم کو داستانوں میں ملتے ہیں مگر ان کی عبارت مقفیٰ او مسجع ہوتی تھی اس میں فقرہ بازی طعن و تشنیع زیادہ اور ظرافت کے نمونے کم ہی ملتے ہیں۔ غالب کے خطوط اور اوودھ پنچ اخبار نے طنز مزاح میں سادگی کا استعمال کر کے اس کو فروغ دیا۔ بقول وزیر آغا:

> ''اودھ پنچ نہ صرف اردو کا پہلا طنزیہ اخبار تھا بلکہ اس نے اردو میں پہلی بار مغرب کے طنز و مزاح کے حربوں کا استعمال کیا دوسرے یہ کہ سیاسی اور مجلسی مسائل پر بھی بھر پور طنز کا آغاز اودھ پنچ سے ہی ہوتا ہے۔''

(اردو ادب میں طنز مزاح وزیر آغا ص ۳٦٨)

طنز و مزاح نگاری کا وسعت عطا کرنے میں احمد شاہ پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی ، رشید احمد صدیقی فکر تونسوی، کنہیا لال پور، کرشن چند، مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی (جن کا بھی ٹونک ہی سے تعلق تھا) نے طنز مزاح کو بین الاقوامی سطح پر شہرت عطا کی۔ موجودہ دور میں طنز و مزاح کی اس روایت کے امین بن کر مختار ٹونکی دنیائے ادب میں اس کی بقا اور تسلسل کے لیے کوشاں ہیں جن کا تعلق بھی ٹونک ہی سے ہے۔ اس صنف میں انھوں نے اعلیٰ ترین اور بہترین نمونے پیش کئے ہیں جن کے لیے ان کے مجموعوں کا

مطالعہ ناگزیر ہے۔

مختار ٹونکی کے پانچ مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جو کہ پوری طرح سے طنز و مزاح اور انشائیوں پر مشتمل ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ تمام طنشائیوں پر دلالت کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے انشائیوں کو طنز و مزاح کے ساتھ ملا کر ایک نئی صنف ایجاد کی ہے اور وہ ہے طنشائیہ یعنی اپنے طنز کو انھوں نے انشائیے کی چاشنی میں لپیٹ کر دیا ہے تا کہ قاری کو گراں بھی نہ گزرے اور وہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں۔ ان کے مجموعے مندرجہ ذیل ہے۔ اوٹ پٹانگ ۱۹۹۴ء، لغویات ۲۰۰۱ء، خرافات ۲۰۱۵ء، مزخرافات ۲۰۱۷ء، ہفوات ۲۰۲۰ قابل ذکر ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کے ہم وطن ہونے کے وجہ سے مختار ٹونکی بھی طنز و مزاح میں ان کے معتقد نظر آتے ہیں اس ہم وطنی اور اعتقاد کے ساتھ ساتھ دوسری خوبی مسعود اختر یہ بتاتے ہیں کہ

> ''دونوں ہی مزاح میں ہزل، تضحیک، تذلیل، پھکڑ بازی، رکیک، پوچ، فحش اور ادق گوئی سے سخت پرہیز کرتے ہیں۔ تیسری صفت ان کی یہ ہے کہ دونوں ہی شگفتہ طنز، خالص مزاح، فکاہت، تعریض، لطیفہ، ایجاز، رعایت لفظی، پیروڈی بذلہ سنجی، خاکہ، شوخ بیانی، کلکاری، کے ستھرے ذوق سے قاری کو مسکرانے کی ہمت دیتے ہیں خزاں کے دور میں جو مسکرا نہیں سکتے وہ لطف فصل بہاراں اٹھا نہیں سکتے''[۱]

(ماہنامہ شگوفے مضمون مختار ٹونکی جن کے سر ہے طنز و مزاح کی کلاہ افتخار مسعود اختر ص ۴۵)

اس اقتباس سے مختار ٹونکی کی طنز اور ظرافت کے تعلق قدر اور تعین کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کس طرح فراخ دلی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی جادو بیانی کا ثبوت دیا ہے۔

طنز و مزاح نگاری کو اگر چہ ادب میں دوسرے درجے کا ادب سمجھا جاتا ہے، پھر بھی اس کے اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے اس کا اندازہ ہم رونالڈ ناکس (Ronald knox) کے اس فقرے سے لگا سکتے ہیں کہ مزاح نگار خرگوش کی طرح بھاگتا ہے لیکن طنز نگار کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔[1] (اردو ادب میں طنز و مزاح وزیر آغا ص ۴۸)

اس بات کی وضاحت مختار ٹونکی صاحب اپنے مجموعے ''اوٹ پٹانگ'' کے ابتدائیہ میں اس طرح کرتے ہیں کہ

> ''ہم نے دونوں میدانوں میں چھلانگ لگائی ہے یعنی رونالڈ ناکس کے مطابق خرگوش کے ساتھ بھاگے ہیں اور کتوں کے ساتھ شکار بھی کھیلا ہے اور وزیر آغا کے لفظوں میں ہر دو طرح ہنسنے کی پریکٹس بھی کی ہے''[2]
>
> (اوٹ پٹانگ ابتدائیہ ص ۱۱)

مختار ٹونکی کا مقصد صرف طنز کرنا ہی نہیں ہے بلکہ سماج میں پھیلی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کو بھی ظاہر کرنا اور ان کی اصلاح کرنا ہے۔ ان کی نثر میں کاٹ کرنے کا مقصد انحطاط اور ناسازگاری کا اختتام کر کے سماج میں خوشی و انبساط، محبت اور خلوص اور فرحت و مسرت کی فضاؤں کا غلبہ کرنا ہے۔ ان کے مضمون ''اختلاف زندہ باد'' مذہب کے نام پر ہونے والے

اختلافات کی رنگارنگی کوظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

''کہیں ہر ہر مہادیو ہے تو کہیں گھنشیام ہے پھر دوچار نہیں، دس بیس نہیں۔خدا نظر بد سے بچائے پورے تینتیس (۳۳) کروڑ دیوی دیوتا ہیں۔شومئی قسمت یہ ایک ایک دیوتا بھی اکثریت کے حصے بخرے میں نہیں آتا ہے خوردونوش اور لباس و پوشاکو دیکھو کہ رسم ورواج کے آئینے میں جھانکو یہاں بھی اختلاف کی جھلکیاں ملیں گی کوئی گھاس پوس کھا رہا ہے تو کوئی روٹی بوٹی اڑا رہا ہے۔ادھر دال باٹی چورما ہیتو ادھر انڈا مچھلی قورمہ ہے۔اس کے علاوہ ایک دوسرے اقتباس میں بھی ان کی طرز اسلوب پر نگاہ ضروری ہے طرفہ یہ ہے کہ یہاں کی اقلیت بھی اختلاف کا شکار ہوگئی ہے۔بہتر (۷۲) فرقوں کا سجا ہوا بازار ہے۔شیعہ اور سنی میں جوتم پیزار ہے تو بریلوی، دیوبندی میں کشتم پچھاڑ ہے۔ارے یہ کون چلایا میں سنی ہوں۔ارے یہ کون ڈکارا میں جماعتی ہوں۔علماء کی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ ہے گرچہ ان کے ہاتھ میں قوم کی ٹوٹی پھوٹی باگ ہے۔

(مضمون اختلاف زندہ باد۔خرافات۔ص ۶۷)

مختارؔ ٹونکی ایک طبیب کی مانند ہیں۔جو ہمارے معاشرے اور عوام میں موجود نفرت اور اختلاف کو درست کرنے کے لیے قلم کو نشتر بنا کر جراحی کا کام لیتے ہیں اور بیماری کا سدباب یوں بھی کیا

جاتا ہے۔ انھوں نے زندگی کا مطالعہ اپنے گہرے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں کیا ہے ،۔سماج کی تمام تر برائیوں، خامیوں اور کمزوریوں کواپنی تحریر میں پرکھااور برتا ہے ۔انھوں نے اپنے موضوعات کا مواد سماج کے افراد کی زندگیوں سے اخذ کیا ہے ۔ایک ادیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہردم چوکنا رہےاور وہ سماج کی اصلاح کا کام انجام دے سکےاورلوگوں میں وہ احساس پیدا کر سکے کہ وہ اپنی کمزوریوں کا علاج کر سکے۔

موصوف نے اپنی طنز ومزاح نگاری میں اپنے عہد کی صورت حال کا بھی بیان کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے زندگی کے معمولات اورواقعات کواپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ ہرادیب اپنے عہد کا ترجمان ہوا کرتا ہے ۔اوراس کی تحریر میں اس کے عہد کی جھلکیاں صاف طور پرنظر آتی ہیں جواپنے عہد کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔

اسی طرح رشوت ہمارے سماج میں ایک گرگٹ کی طرح سے ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے سامنے الگ الگ رنگ روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔کہیں ڈونیشن کے نام پرتو کہیں کمیشن کے نام پرتو کہیں ایڈجسمنٹ کے نام پر رشوت لی جاتی ہے۔انھوں نے رشوت کے مختلف کے طریقوں کا جزیوں نکالا ہے۔؛؛ر؛؛ سے روپیہ؛؛ش؛؛ سے شکرانہ؛؛و؛؛ سے وظیفہ اور؛؛ ت ؛؛ سے تحفہ؛؛ن؛؛ سے نذرانہ اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں اس طرح کی مثالوں کے ساتھ رشوت کا دوسرا پہلو بھی دکھاتے ہیں کہ

’’اگر آپ کسی مندر میں قدم رکھتے ہیں یا کسی بزرگ کے مزار مقدس کی

زیارت کریں تو آپ کو دوشیزۂ رشوت کا جمال دل افروز دیکھنے کو مل جائے گا بھکت جن اور عقیدت مند جو بھینٹ چڑھاتے ہیں وہ خالص دیسی گھی کی طرح خالص رشوتہے ، بھگوان کو بھوگ مفت میں نہیں دیا جاتا ہے اور پیر فقیر کی تربت پر کوئی چڑھاوا بغیر منت کے نہیں ہوتا ہے۔''

(مزخرافات۔مضمون رنگہائے رشوت۔ ص ۱۷)

''پیٹ اور پلیٹ''میں انسانی زندگی کی مجبوریوں اور روزگار کے کھیل پر جو طنز کیا ہے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سماج کتنا بچھڑا ہوا ہے:۔

'' یہ پیٹ ہی تو ہے جو اتاشی کو بھی راشی بنا دیتا ہے اور نادار کو زردار کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔عورت اپنی حرمت وعصمت بیچتی ہے تو پیٹ کی خاطر.....آپ ہمیں بتائیں کہ لوگ قومی سطح پر بھکاری کیوں بنے ہوئے ہیں اور ہمیں سمجھائیں کہ کچھلوگ بین الاقوامی سطح پر کھلاڑی کیوں بنے ہوئے ہیں۔ یہ چیریٹی چندہ وندہ کیا ہے؟ سب پیٹ کا گورکھ دھندہ ہے۔ یہ نذرانہ چڑھاوا کیا ہے۔ پیٹ و پلیٹ کا بلاوہ ہے''۔

(پیٹ اور پلیٹ مزخرفات ص۴۵)

مختار ٹونکی نے اپنے مجموعوں میں اردو ادب کے کینوس پر اپنے طنز کے تیر چلائے ہیں اور اردو ادب ک کساد بازاری کا بھی اپنے مضامین میں اچھوتے انداز سے تذکرہ کیا ہے۔مثلاً چلو

فیکٹری میں ادب تخلیق کرنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔

میں ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں لیکن دنیائے شاعری میں قد آور ہوں اور پورا مست قلندر ہوں۔شہر شہر میں نعرہ ہے شریر بندر ہمارا ہے پروفیسری تو پیشہ ہے شاعری میں پیسہ ہے یونیورسٹی سے غائب رہتا ہوں مشاعروں میں حاضر رہتا اور چند شعر سناتا ہوں ہزاروں روپیئے کماتا ہوں۔خوب وارے نیارے ہیں اور شاعری میں پو بارے ہیں،قطب شمالی پر ہو آیا ہوں وہاں بھی جھنڈے گاڑ آیا ہوں،مجھ سے اچھا کون ہے میرا جیسا کون ہے؟ میں میں میں''

(ادب برائے ڈبل روٹی۔ لغویات ۔ص ۱۰۷)

پطرس بخاری نے ''کتے'' لکھ کر اردو ادب کو کتے سے روشناس کرایا تو مشتاق احمد یوسفی نے ''آب گم'' سبز ماناہری اور مزہ میں کتے کی مختصر سی سوانح عمری بیان کی ہے۔مختصر یہ کہ اردو ادب میں کتے پر کئی ادیبوں نے لکھا ہے موصوف نے بھی اپنے مجموعے لغویات میں بھی ''دو پیروں کے کتے'' لکھ کر اشرف المخلوقات اور کتوں کا موازنہ کیا ہے۔

''آج دو پیروں کے کتوں کا دور دورہ ہے ان کی پرورش اور پرداخت کے لیے سرکار نے جگہ جگہ ڈاگ ڈپارٹمنٹ کھول رکھے ہیں ۔۔۔۔قدرت نے تو پالتو کتے پیدا کئے لیکن حکومت نے فالتو کتوں کی بھی فوج کھڑی کر دی ہے۔''

(دوپہر کے کتے۔ لغویات ۔ص۴)

مختار ٹونکی نے اپنی تحریروں میں پیروڈی اور تحریف نگاری سے بھی استفادہ کیا ہے۔جو

دلچسپی سے بھرپور رہونے کے ساتھ مزاحیہ پہلوؤں میں اپنی بات کے واضح کرنے کے لیے بھی اضافہ کرتے ہیں۔ جس کو پڑھ کر قاری بغیر مسکرائے نہیں رہ سکتا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

ہزاروں سال آٹا اپنی بے قدری پہ روتا ہے بڑی مشکل سے پایا ہے توے روٹی بن رتبہ

نان ہے تو جہان ہے پیارے

صرف مرغی پہ منحصر نہیں غالبؔ بیضہ مخصوص سب کا ہی مدور ہے

ڈھونڈو گے ہمیں کونوں کونوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

یہ ان کی خوبی ہے کہ وہ بے تکی باتوں میں بھی تک پیدا کر کے قاری کی توجہ اپنی طرف کر لیتے ہیں۔ جہاں پر وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرتے ہیں وہیں پر وہ عربی و فارسی کے الفاظ، مثالیں اور محاوروں کے استعمال سے اپنی تخلیقات میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ موصوف اپنے مضامین کے عنوانات میں بھی اسی طرح کی تبدیلی سے مزاحیہ عنصر پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

حی علی الفلاح - حی علی المزاح (مزاحیہ)

دریں چہ شک بلکہ سو بار دریں چہ شک

ٹی۔وی بنام بیوی ،خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہیں

ماڈرن قصائی، خدا کی پریشانی، دو پیر کے کتّے، مویشیائی ادب

پاپائے اردو، نیکر راج، ٹرک چھاپ شاعرے، پڑوار دو کھود و گھاس

مختار ٹونکی نے خاکے کے فن میں اپنی مہارت دکھائی ہے۔ان کے مزاحیہ فن پارہ میں خاکوں کی جھلک نظر آتی ہے۔مگر انھوں نے کم ہی خاکے لکھے ہیں۔اپنے پہلے مجموعے'' اوٹ پٹانگ''میں انھوں نے اپنے ایک دوست کا خاکہ لکھا تھا مگر اس مزاح کو نہ سمجھ سکے اور ان سے ناراض ہوگئے۔مختار صاحب نے اس کا نام بدل کر اپنے مجموعے میں پیش کیا۔انھوں نے اپنے مجموعے میں'' گل پوشی خزاں رسیدہ گلزار کی'' کے عنوان پر شگفتہ انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ان کے ایک خاکہ کا اقتباس درج ذیل ہے:

'' یہ جغرافیہ کی بات بھی آپ نے خوب کہی۔کسی زمانے میں ان کے حلیہ شریف پر جغرافیہ کی اصطلاح فٹ بیٹھی ہوگی۔اب تو وہ جغرافیہ اور آثار قدیمہ میں گڈ مڈ ہو کر رہ گئے ہیں دیکھو تو زمانے کے سرد و گرم چشیدہ اور گرگ باراں دیدہ نظر آتے ہیں قریب جاؤ تو مرد میز ار اور خزاں رسیدہ بہار معلوم ہوتے ہیں۔نہ عوج بن عوق طرح لمبے تڑنگے اور نہ ہی ازمنہ قدیم کے بونوں کی طرح کوتاہ جسم اور پستہ قد۔گورے چٹے بھی نہیں ہیں کہ جو دیکھے فریفتہ ہو جائے اور اتنے کالے کلوٹے بھی نہیں کہ افریقہ کے حبشیوں کی یاد آئے۔سانولے سلونے گل محمد کے بیٹے گلزار احمد خان کامن ناؤن کی طرح سے بس ایک واجبی واجبی سے انسان ہیں۔

(اوٹ پٹانگ گل پوشی خزاں رسیدہ گلزار کی ص ۹۹۔۱۰۰)

اسی طرح سے انھوں نے ایک مضمون 'خرافات' میں ''مولانا راکٹ'' کے عنوان سے لکھا ہے۔جس میں خاکہ کی جھلک نظر آتی ہے۔اشارے کنائے میں انھوں نے کسی شخص کے اوصاف مولانا راکٹ کے نام سے تحریر کیے ہیں:۔

''مولانا راکٹ ویسے تو واقعی مولانا ہیں فارغ التحصیل،سند یافتہ،شرعی پنجامہ ہولڈر اور باقاعدہ ڈاڑھی دار امور شرعی اور مذہبی مسائل سے خبردار پہلی بار اگر کوئی ان سے مشرف بہ دیدار ہوتو کہہ نہیں سکتا کہ وہ کوئی مضحکہ خیز قسم کے آدمی ہیں۔بس ہر کام میں ان کی چیتے جیسی پھرتی آدمی کو چونکاتی ہے۔وہ اتنی تیزی سے اٹھک بیٹھک اور چلت پھرت کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ کوئی کٹھ پتلی کسی کی انگلیوں کے اشارے پر ناچ رہی ہے۔''

(خرافات مولانا راکٹ۔ ص ۱۹۱)

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختار ٹونکی اردو ادب میں طنز و مزاح نگاری میں بلند مقام رکھتے ہیں۔وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ان کا عمیق و وسیع مطالعہ ان کے فن کارانہ مہارت کو ظاہر کرتا ہے۔ان کے مضامین طنز کا تیکھا پن نہیں ہے نہ ہی لہجے میں تلخی کا احساس ہوتا ہے۔وہ ہلکے پھلکے انداز میں مزاح پیدا کرنے میں ماہر ہیں۔

☆ ☆ ☆

جناب مختار ٹونکی صاحب کی چند یادگار تصویریں

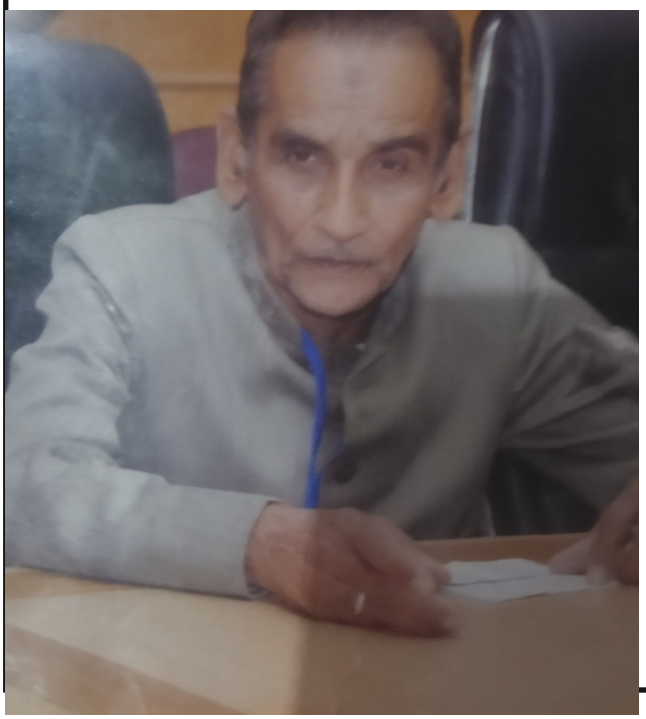

Mukhtar Tonki
shakhsiyat aur Adbi Karname
(मुख्तार टोंकी शख्सियत और अदबी कारनामें)

A THESIS

Submitted for the award of Ph. D. degree

In Urdu

(Faculty of Arts)

To the

University of Kota

By

SULTANA FATIMA ANSARI

Under the supervisior of

Dr. Nadira Khatoon

Department of Urdu

Govt. Arts Girls College, Kota

UNIVERSITY OF KOTA, KOTA (RAJASTHAN)

2021